عدد ۶	ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء	جلد ۳۸

مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحات
شذرات	سید سلیمان ندوی،	۴۰۲-۴۰۴
کتبخانۂ حمیدیہ	"	۴۰۵-۴۱۱
دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم،	جناب پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے، نظام کالج، حیدرآباد دکن،	۴۱۲-۴۲۵
کلام خواجہ سنائی غزنویؒ	جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی	۴۲۶-۴۲۸
اسلام سوڈان میں،	مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دار المصنفین	۴۲۹-۴۳۸
عباسی دربار کے اثرات عربی ادب وثقافت پر	جناب عبد القیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی،	۴۳۹-۴۴۷
کائنات بغیر خدا کے	"ع ز"	۴۴۸-۴۵۲
مدت حیات کی توسیع،	"	۴۵۳-۴۵۵
اخبار علمیہ	"	۴۵۶-۴۵۹
حمایت اسلام کا مطبوعہ قرآن پاک،	"س"	۴۶۰-۴۶۳
"نقش ونگار"	شاہ معین الدین احمد ندوی،	۴۶۴-۴۷۵
مطبوعات جدیدہ،	"	۴۷۶-۴۸۰

شذرات

ایک نواب عالم کی وفات،

ہندوستان کے اُن پرانے مسلمان خاندانون مین سے جو شرافتِ نسب کے ساتھ علم اور دولت دونون کے جامع ہین، اب خال خال گھرانے رہ گئے ہین، انہی مین سے ایک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کا خاندان تھا، جن کے چھوٹے صاحبزادہ صفی الدولہ حسام الملک شمس العلما، نواب سید محمد علی حسن خان مرحوم نے ۱۹ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء مطابق ۳ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۵ھ کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہوس لال باغ لکھنؤ مین بہتر برس کی عمر مین وفات پائی، افسوس ہے کہ ایک پرانے خاندان کے فضل وکمال اور جاہ وجلال کی یادگار آج مٹ گئی،

مرحوم ان لوگون مین تھے جن کی آنکھون نے مسلمانون کے علمی و تعلیمی سیاسی وتمدنی انقلاب کے مناظر دیکھے، وہ پیدا تو ایک "کنسر ویٹو" گھرانے مین ہوے، اور اسی ماحول مین تعلیم و تربیت پائی، لیکن فطرت کی طرف سے وہ ایک اثر پذیر اور حساس دل لائے تھے، باوجود اس کے کہ وہ بھوپال مین پیدا ہوئے جہان حد درجہ قدامت کی حکومت اور سطوت تھی، اور ممکن نہ تھا کہ نورمحل مین نئی روشنی کی ایک کرن بھی پہنچ سکے، مگر استعداد طبع دیکھئے کہ خود بخود ادھر طبیعت کا میلان ہوا، سرسید کی جدید تعلیمی تحریک مین، اور پھر ندوۃ العلماء کی مذہبی تحریک مین شریک ہوے اور ہر قسم کی جانی و مالی خدمتین انجام دین، مدت تک ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دارالمصنفین کے اساسی ارکان مین تھے، اور لکھنؤ کی ہر سنجیدہ تحریک مین انکا

نام سرِ فہرست رہتا تھا،

وہ عربی زبان کے عالم، فارسی زبان کے ماہر اور اردو کے مشاق اہل قلم تھے، فارسی شعر وسخن اور محاورات پران کو عبور کامل حاصل تھا، فارسی کا مشکل سے کوئی اچھا شعر ہوگا جو اُن کو یاد نہ ہو، خود بھی فارسی مین اکثر اور اردو مین کمتر شعر کہتے تھے، انھون نے اپنے والد ماجد کے زمانۂ عروج مین دنیا بھر کے مشرقی علماء وفضلا کی صحبتین اٹھائی تھین، اور سوائے علمی وادبی چرچون کے اُن کے کانون مین کوئی بات پڑی بھی نہ تھی، ان کے لئے ان کے والد نے ہر فن کے باکمال استاد مقرر کئے تھے، جنکے سایۂ تربیت مین وہ پلکر جوان ہوئے

وہ ہماری زبان کے مصنف بھی تھے، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابین اُن کے قلم سے نکلین، شعراء کے تذکرے ان کی جوانی کی یادگار ہین، فطرۃ الاسلام اور مآثر صدیقی ان کی بہترین کتابین ہین، آخر مین "مردمِ دیدہ" کے نام سے ان باکمالون کے حالات لکھ رہے تھے جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی تعداد کچھ کم نہین، ان مین بڑا حصہ شعراء کا تھا،

وہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے بے تکلف دوستون مین تھے، اور ایک دوسرے کے سچے قدردان تھے، یہی وراثت منتقل ہوکر ہم تک پہنچی، موصوف کو ہم لوگون سے اس درجہ محبت اور شفقت تھی جو خاندانی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی، اور اس کو اس وضعداری سے نباہا کہ تیس برس کے عرصہ مین ایک دفعہ بھی اس مین فرق نہ آیا، وہ مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن اور نیک طینت تھے، شر وفساد سے طبعی نفور تھا، اور ہنگامہ آرائیون سے کوسون دور تھے، تمول کے باوجود خاکسار، اور علم وفضل کے باوجود ملنسار تھے،

مذہبی خیالات مین گو وہ عقلیت کی طرف مائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ مذہبی پابندی ان مین اتنی

سخت تھی کہ ان کی ایک نماز بھی ان کے مقررہ اوقات سے ٹلنے نہیں پاتی تھی، رسم و رواج و بدعات کا ان کے گھر میں نشان نہ تھا، اور اس بارہ میں وہ نہایت سخت تھے، ان کی محفل میں علم و فن شعر و سخن اور قومی مسئلوں کے سوا کوئی اور مذکور نہ تھا، عربی کتابیں ان کو پڑھے ہوئے مدت ہو چکی تھی، اور پھر ان کا کوئی مشغلہ نہ رہا، تاہم جب ذکر آجاتا تو ان کو بھولے ہوئے خواب کی طرح بہت سی باتیں یاد آجاتی تھیں،

———

نور محل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک پرانے خاندان کا چراغ سحر تھا، کہ نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم و فضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا جہاں خدا چاہے نور کے سوا ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ! حسام الملک! اب تو وہاں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمالِ نیک کی دولت اور تیرے کارِ خیر کی مملکت تیرے ساتھ ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق، اپنے ملکِ لازوال کی دولتِ جاوید سے تجھکو سرفراز فرمائے۔

———

"سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں"

"مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید"

۵ نومبر کی فلسطین کانفرنس دہلی میں ایک صاحب نے ۵۰ صفحوں کا ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں[1] کے مطلا عنوان سے مجلد میرے ہاتھ میں دیا، میں نے فرصت کے وقت میں اس کو بغور پڑھا، تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے بڑی محنت اٹھا کر میری پہلی بڑی تصنیف "ارض القرآن" سے لیکر "عربوں کی جہاز رانی" تک میری چند غلطیاں[1] فراہم کی ہیں، اور اس پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور بعض دوسرے اکابر علماء سے مداحانہ تقریظیں لکھوائی ہیں، کتاب میں مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میری تصنیفات سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں،

———

مجھے اس رسالہ کو پڑھکر دو خوشیاں ہوئیں، ایک تو یہ کہ میری تصانیف کے ہزاروں اوراق میں بحمد اللہ کہ قرآن پاک کی چند ہی غلطیاں ہیں، دوسری یہ کہ مصنفِ رسالہ اور ایک دو بریلویوں کو چھوڑ کر ان اکابر علماء نے انکو صرف "مسامحات" قرار دیا، تکفیر و الحاد کا فتویٰ نہیں دیا،

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اور یہ مسامحات بھی بیشتر وہی ہیں جو جامعہ وغیرہ میں پہلے دکھائے جا چکے ہیں،

———

میں بھی اور دلی کے علماء اور ثقات بھی یہ خوب جانتے ہیں کہ ان اوراق کے اصلی مصنف کون ہیں؟

سرایں رشتہ زجائیست کہ من میدانم

ان صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس فریب و سازش سے محافظینِ حدیث و سنت کو خود اُن کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرایا جا سکتا،

———

اتنی کاوشوں کے بعد بھی جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ میرے "گیارہ اغلاط" میں سے دو تو چھاپے کی غلطیاں ہیں، جنمیں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کی تنقید کے جواب میں دو سال ہوئے کہ اسی معارف میں کیا جا چکا ہے کہ میں نے قِط کا ترجمہ "چھٹی" نہیں بلکہ "چٹھی" کیا ہے، اور دوسری یہ ہے کہ عربوں کی جہاز رانی میں "ایک" کے بجائے "ہر ایک" پڑھئے جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے، ارض القرآن میں دو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں، وہ معترض کی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہیں،

[1] صاحب رسالہ نے لکھا ہو کہ انھوں نے مجھے ان اغلاط کی تصحیح کے لئے کئی خط لکھے مگر میں نے جواب نہیں دیا، یہ میرے علم میں قطعاً خلاف واقعہ ہے، زمانہ ہوا قرول باغ دہلی سے خطبات مدراس کی ایک مشتبہ عبارت کے متعلق وہی سوال آیا تھا جو اس رسالہ میں ہے اور میں نے اسکا جواب دیدیا تھا،

بقیہ چہ غلطیاں یہ ہیں کہ مباحثِ برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوالِ مفسرین سے الگ ان آیتوں کے محل سمجھے ہیں یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں وہ برزخ پر چسپاں کردی ہیں، اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہئے تھی وہ بہشت کے موقع پر لکھدی ہے، اگر اقوالِ مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء کے الحاد کا فتوی دینا ہوگا،

مسئلۂ عدم خلودِ نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بنا پر اگر یہ ہنگامہ ہو تو پہلے یہ ہنگامہ بعض مشاہیر صحابہؓ[1] بعض تابعینؒ اور مفسرین کے اور خصوصیت سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف برپا کرنا چاہئے، حافظ ابن قیم نے حادی الارواح اور شفاء العلیل میں ۲۵ دلیلیں اس پر قائم کی ہیں، اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اہلسنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا سوائے اس کے کوئی قصور نہیں کہ اس نے حافظ ابن قیم کے خیالات کی ترجمانی اردو میں کردی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہؓ، بعض تابعینؒ، بعض مفسرینؒ اور ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہئے،

بہرحال یہ سب تو غالب کے مقطع کی "سخن گسترانہ" باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی و نقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں تو بشارت، اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو یہ پرحسرت پیام سناتا ہوں کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے اڈیشن میں کردی گئی ہے، اور کچھ کی اب کردی گئی ہے، اور پہلے اڈیشن کے موجودہ ذخیرہ میں بھی کردی گئی ہے، اور مسئلۂ نار میں جمہور کا مسلک صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل اس میں پہلے ہی اضافہ کردیا گیا ہے، واستغفر اللہ ربی من کل ذنب وسوء عقیدۃ فی الدین،

[1] حسب روایات مفسرین، "س"

مقالات

کتبخانۂ حمیدیہ بھوپال،

ایک زمانہ تھا کہ بھوپال مشرقی علوم و فنون کا مرکز تھا، سیکڑوں علماء اور فضلاء تھے، طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیائے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہنچتے تھے، اگر اُسوقت کوئی ریاست کا پبلک کتبخانہ ہوتا، تو اسوقت وہ رامپور، ٹونک، اور حیدرآباد کی برابری کرتا، مگر افسوس ہے کہ اُسوقت کے کتبخانے، امراء کی ذاتی ملکیت اور نشانِ امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہوگئے، اور اب ان کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں،

بھوپال کے امراء میں سے ایک نواب فوجدار محمد خاں کی کتابیں بھوپال میں رہ گئیں، اور انکی یادگاریں کچھ باقی ہیں، غالب کے دیوان کا مکمل اردو نسخہ اسی کتبخانہ سے برآمد ہوا، ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقیین کا نایاب نسخہ جواب کتبخانۂ آصفیہ کا مایۂ نازش ہے، وہ بھوپال ہی کی ملکیت تھا، اور آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں میں بھوپال کی یادگاریں ملیں گی، جن کو تقدیر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے،

ریاست بھوپال میں اصلاحات کا دور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ کے عہد سے شروع ہوا، انہی میں سے ایک پبلک کتب خانہ کا قیام ہے، جو سرکار مرحومہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ، اور والیِ حال نواب حمید اللہ خان بہادر کی طرف منسوب ہو کر حمیدیہ کہلاتا ہے، اسکی عمارت

شاہجہان آباد کے خاتمہ پر ایک نہایت عمدہ و پرفضا موقع پر ہے، عمارت وسیع، بلند اور شاندار ہے، مقام بھی پرسکون اور مطالعہ کے لئے موزون ہے،

میری آمد و رفت بھوپال میں سنہ ۱۹۱۰ء سے ہے، اسوقت تو اسکے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اور معلوم بھی نہیں کہ وہ اسوقت تھا بھی یا نہیں، مگر سنہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب مولینا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سرکار عالیہ مرحومہ کی طلبی پر حاضری ہوئی، تو اُسوقت اس کتب خانہ کی حالت نہایت معمولی تھی، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً جاتا ہی رہا، مگر دیکھا تو انگریزی کتابون کی طرف توجہ زیادہ دیکھی، گو شہاں لال صاحب ایک دیسی عیسائی اس کتب خانہ کے ناظم تھے، ظاہر ہے کہ ایک اسلامی اور مشرقی کتب خانہ کی خصوصیتون اور ضرورتوں سے ان کو کیا واقفیت ہو گی، گو اس وقت بھی کہنے کو مشرقی صیغہ موجود تھا، البرامکہ کے مشہور مصنف مولوی عبدالرزاق صاحب یہیں بیٹھکر سرکار عالیہ مرحومہ کے اخیر زمانہ میں تاریخ اسلام کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہتے تھے،

اُسوقت تک جو کچھ تھیں مطبوعہ کتابیں تھیں، قلمی کتابیں گویا نہیں تھیں، افسوس ہوتا تھا کہ ایک مشہور اسلامی ریاست جس کی نیک نامی کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، وہ اس حیثیت سے اتنی تہی مایہ ہو،

سب سے اخیر دفعہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء میں کئی سال کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا، اعلیٰ حضرت سکندر صولت بہادر کی فرمانروائی کے عہد میں یہ دوسری بار بھوپال کی حاضری تھی، خیال آیا کہ اس علمی سیرگاہ کی پھر زیارت کر لی جائے،

اس دفعہ جو کتب خانہ گیا، تو وہاں کا رنگ بدلا پایا، کتابیں بھی زیادہ تھیں، اور سلیقہ سے تھیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ مشرقی صیغہ کو بھی مرتب اور پہلے سے زیادہ معمور پایا، قلمی کتابون کا ذخیرہ بھی خاصہ دیکھا، بعض پرانے شاہی فرامین اور مغل شہزادیوں کی مشقی وصلیان اور قطعات نظر آئے،

بابر کا فرمان، بابر کا وہ پرانا فرمان جسکو سنہ ۱۹۱۴ء میں دیکھ چکا تھا، اب بھی موجود تھا، یہ چھوٹی تقطیع کے معمولی کاغذ پر خط نستعلیق میں تحریر ہے، اس میں بابر نے ہمایوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے نصیحت کی ہے، کہ وہ ہندوئوں کا دل اپنے ہاتھ میں لے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ گائے کی قربانی بند کر دے، میں اس فرمان کو پہلے بھی جعلی سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہون، اس پر چند سال کے عرصہ میں بہت سے ارباب تحقیق نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں، مسلمان فضلاء نے مذہبی تعلق سے قطع نظر کرکے صرف علمی اور فنی حیثیت سے اسکو بالکل غیر معتبر ٹھہرایا ہے، ابھی ایک سال ہوا ہوگا، کہ بعض روزانہ انگریزی اخبارات میں وصیت نامہ کی روشنی میں مسلمان سلاطین ہند کی بے تعصبی کو بہت کچھ سراہا گیا تھا،

میرے قیاس میں یہ دستاویز مغل حکمرانوں کے اخیر عہد میں تصنیف ہوئی ہے، جب حکومت پر راجپوت راجاؤں کا اثر و اقتدار کافی مضبوط تھا، اور اُن کے مشورہ سے بادشاہ وقت کی طرف سے ایک فرمان اسی مضمون کا تمام ممالک محروسہ میں جاری ہوا تھا،

نورجہان کا نوشتہ، کتب خانہ میں دو نہایت نادر وصلیاں ہیں، یہ دونوں دو مشہور مغل بیگموں کے ہاتھون کی لکھی ہوئی ہیں، ایک نورجہان بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، عبارت حسب ذیل ہے،

باعثِ انبساطِ شہنشاہی،

بربیتِ مہ نور

از عدلِ شہنشاہی معمور جہان باشد

وز نور جہانگیری پر نور جہان باشد

نمیقۂ نورجہان سنہ ۱۰۲۹

معلوم ہوتا ہے کہ نورجہان نے یہ وصلی لکھکر جہانگیر کی خدمت پیش کی تھی،

زیب النساء کا نوشتہ، عالمگیر اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النساء کے علمی کمالات کا ذکر تاریخ کے اوراق میں رہ گیا ہے، اس کے نام سے علماے وقت نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں ان میں سے صرف ایک کا سراغ مل سکا ہے، باقی کے صرف نام ہی نام اب تک سنے ہیں،

بیگم کو خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، مورخین کے اس متفقہ بیان کی تصدیق کتبخانہ حمیدیہ کی ایک وصلی سے ہوتی ہے، یہ وصلی بیگم نے عالمگیر کی خدمت میں اسوقت پیش کی تھی، جب اس نے ۱۱۱۱ھ میں مرہٹوں کے دار الحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا، اس وصلی میں ایک شعر ہے، جس میں ستارہ کی فتح کی ایک نہایت عمدہ تاریخ کہی گئی ہے،

از معجزۂ پیمبر شق القمر عیان شد

فتح

اعجاز خسروی بین شقِ ستارہ آمد ستارہ

زیب النساء

بیگم کے استاد ملا سعیداے اشرف عہد شاہجہانی کے مشہور خطاط آقا عبد الرشید دیلمی کے شاگرد تھے، شاید بیگم کو یہ فیض یہیں سے پہنچا ہو،

کتابیں، کتب خانہ کی قلمی فہرستیں موجود تھیں، سرسری نظر سے جو کتابیں یادداشت کے قابل نظر آئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- **اسناد عبد اللہ بن سالم بصری**، یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شیخ ابو طاہر مدنی کے شیخ تھے، اور علوم حدیث میں یکتاے روزگار تھے، ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی، مصنف نے اس رسالہ میں اپنے اسانید یکجا کئے ہیں، رسالہ کی کتابت ۱۱۹۹ھ میں ہوئی ہے، اس رسالہ کو الامداد بمعرفۃ علو الاسناد شیخ سالم بن عبد اللہ بن سالم بصری کی سے ملا کر دیکھنا چاہیے، شاید وہی ہو،

۲- **العلل المتناہیہ فی الاحادیث الواہیہ**، محدث ابن جوزی کی نہایت اہم

تصنیف ہے، اس میں ضعیف و موضوع احادیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، نسخہ نیا ہے، ۱۲۹۵ھ میں نقل ہوا ہے،

۳- **تفسیر وجیز واحدی**، واحدی نیشاپوری المتوفی ۴۶۸ھ کی مختصر عربی تفسیر، مصنف کی بڑی، اوسط اور چھوٹی تین تفسیریں بسیط، وسیط اور وجیز کے ناموں سے ہیں، یہ وجیز کا نسخہ ہے، اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، اس کتاب کا عمدہ نسخہ رام پور میں ہے، جو ۶۵۰ھ میں چمپانیر واقع گجرات میں لکھا گیا ہے،

۴- **تیسیر البیان فی تفسیر احکام القرآن**، مصنف کا نام محمد بن علی بن ابراہیم یمنی ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ میں نظر سے گذرا، دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، تیسرا نسخہ یہاں نظر آیا، ۱۰۶۱ھ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، بھوپال کا نسخہ ۱۱۵۱ھ کا ہے،

۵- **صحیح بخاری** جلد اول کا ایک نہایت عمدہ مطلا نسخہ جس پر اکبر بادشاہ اور محمد شاہ کی مہریں ثبت ہیں،

۶- **الدیباج علی مسلم بن الحجاج سیوطی**، صحیح مسلم کی شرح،

۷- **زرکشی**، بدر الدین زرکشی کی شرح بخاری جسکا نام التنقیح علی الجامع الصحیح ہے، اس کتاب کے اور بھی نسخے نظر سے گذرے ہیں، مگر یہ نسخہ زیادہ قدیم معلوم ہوا، ۸۵۵ھ کی کتابت ہے، اور مصنف کی وفات ۷۹۴ھ میں ہوئی ہے،

۸- **کرمانی** شرح صحیح بخاری، کتاب کا اصلی نام الکواکب الدراری علی صحیح البخاری ہے، مصنف کا نام شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی المتوفی ۷۹۶ھ ہے، شرح کا ممتاز پہلو یہ ہے، کہ اسمیں احادیث کے لغت و نحو سے خاص طور سے بحث ہے، ۷۷۵ھ میں تکمیل کو پہنچی،

۹- **ابن ابی شیبہ**، اس کتاب کے متفرق اجزا مختلف کتب خانوں میں نظر آئے کامل کہیں نہیں دیکھی، یہاں بھی کامل نہیں، یہاں کے نسخہ پر نام مسند ابن ابی شیبہ لکھا ہے،

۱۰- **طبقات الفقہاء، ابن کمال پاشا**، حنفی فقہاء کے حالات میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ایک اخیر کتاب یہ ہے، مصنف کا نام شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا ہے، سلطان سلیم کے عہد میں مشہور ترکی عالم تھے، سنہ ۹۴۰ھ میں وفات پائی، کتاب گو مختصر ہے، مگر ابن قتلوبغا کی تاج التراجم کے بعد کے لئے یہ مفید ہے، اس کا کوئی اور نسخہ نظر سے نہیں گذرا،

۱۱- **فتاوی واقعات المفتیین**، مصنف کا نام عبد القادر بن یوسف،

۱۲- **فتاوی اکبر شاہی**، مصنف کا نام عتیق اللہ،

۱۳- **ارشاد** شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف میں سے یہ رسالہ یہیں نظر آیا، یہ اصول حدیث میں ہے،

۱۴- **عجائب البلدان**، فارسی،

۱۵- **تاریخ افغانی**، شیر شاہ سوری کے حالات میں عبد اللطیف بیجاپوری کی تصنیف،

۱۶- **تاریخ ناصر شاہی**، مانڈو (مالوہ) کے سلطان ناصر الدین خلجی کے حالات،

۱۷- **رقعاتِ عالمگیری**، رقعات کا یہ نسخہ دوسرے نسخوں سے الگ معلوم ہوا، اسکے مرتب کا نام آل محمد صالح ہے، اس میں پہلا خط شاہِ ایران کے نام ہے، عبارت یہ ہے:-

"نامۂ اورنگ زیب بہ اورنگ آرا ے ولایت طہران"

آغاز یہ ہے:

"حمدے کہ طائرانِ ریاضِ ملکوت"

۱۸- **کلیاتِ** انوری کا ایک عمدہ نسخہ مع غزلیات و رباعیات،

اور بھی کچھ نادر کتابیں ہوں گی، جو سرسری نظر میں رہ گئی ہوں گی،

کتب خانۂ حمیدیہ کا موجودہ ذخیرہ بہر حال ترقی و تکمیل کا بہت زیادہ محتاج ہے، اس وقت بھی صرف بھوپال میں اتنی کتابیں ہیں، جن کو ایک جگہ جمع ہی کر دیا جائے، تو بہت کافی ہو سکتا ہے، وہاں کے ایک تاجر کتب قلمی کے پاس سیکڑوں کتابیں ہیں، اگر سال میں تین ہزار روپیہ بھی قلمی کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جائے تو بھوپال کا کتب خانہ بھی چند برسوں میں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کا مقابلہ کرنے لگے، مگر ابھی تو جو کچھ ہے وہ آغاز ہے، اسلاف کا سرمایہ ہندوستان سے یورپ کو بہا جارہا ہے، ہمارے امراء کی تھوڑی سی قدردانی کا ہاتھ اس سیلاب کو روک سکتا ہے، کیا سرکار بھوپال کی توجہ ادھر مبذول ہو سکتی ہے،

دیوانِ شمس تبریز از مولینائے روم،

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاد فارسی نظام کالج حیدر آباد دکن

۱۲

توحید دین کی اہم ترین نعمت توحید ہے، اسلام کا کمال بھی توحید ہی میں پوشیدہ ہے، لازماً اربابِ صفا اور مخلصین کا زیادہ تر زور اسی مسئلہ پر ہے، خالص عبدیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ شرک کے ظاہری و باطنی سارے اعتبارات دور نہ ہو جائیں، اور بندہ بادۂ وحدت سے سرشار نہ ہو اسلئے قرآن مجید میں سورۂ توحید کا نام سورۂ اخلاص رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ بندہ کے اندر خالص توحید پیدا کرتا ہے، اور شرک کے امراض کا شافی علاج ہے، توحید ہی مسلکِ ابراہیم کا طرۂ امتیاز ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ میں بنی نوع انسان کو حکم ہے، کہ مسلک و ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں،

مولینائے روم کے دیوان میں عناصرِ تصوف میں سے عنصر توحید پر سب سے زیادہ زور ہے، اور یہی ان کے مسلک کی روح ہے، توحید کے معنی صرف خدا کو ایک ماننے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ ایک کے ہو رہنے، ایک کو محبوب مقصود اور مطلوب بنانے اور ایک ہی کی رضا پر چلنے کے ہیں، مولینا نے اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور اس باب میں ان کا جوش کامل طور پر ظاہر ہوا ہے ع ویکے گو و یکے میجوئے واز دوئی ترس بس ماسوا کے دام سے رہائی کے طالب ہیں،

خلاصم دہ خلاصم دہ خلاصم — کہ سخت افتادہ ام در دامِ دیگر،

منزلِ مقصود حق ہے،

سوئے مغرب نرویم و طرفِ مشرق نے — تا ابد گام زناں جانبِ خورشیدِ ازل

خواندہ ایم انا الیہ راجعون، — تا بدانی کہ کجا ہا می رویم،

توحید کا آخری مرتبہ توحید ذاتی ہے، مولانا ذکر بھی خاص طور پر اسم ذات کا کرتے تھے، معین الدین پروانہ نے سوال کیا کہ مختلف مشائخ مختلف اوراد و اذکار کے پابند ہیں حضرت کا طریق ذکر کیا ہے، فرمایا،

ذکر ما اللہ اللہ است از آنکہ ما، (اسم ذات) — از الہ می آئیم و باز بالہ میرویم (دیوان)

ع ما زادہ ذاتیم سوے ذات رویم،

ع بر رفتنِ ما وحید یاران صلوات،

"حق تعالیٰ جمیع انبیاء و اولیاء را از اسم مخصوص تجلی فرمودہ است تجلی ما محمدیان از اسم اللہ کہ جامع است تجلی فرمودہ است، من قل ہو اللہ احد را در دہان می دارم"

آخری جملہ میں روم کے اس صوفی اعظم نے تصوف اور کتاب و سنت کا جو ربط ظاہر کیا ہے، خاص طور پر غور و فکر کے قابل ہے، توحید کی جامعیت نسبت محمدی کے طفیل حاصل ہوئی جس کی تعلیم کا حامل سورۂ اخلاص ہے،

صاحبِ مناقب[2] نے مولینا کی ایک دعا نقل کی ہے، جو توحید کے تمام اعتبارات کی جامع ہے، توحید ذات اس میں غالب اور نمایاں ہے،

"اعذت لکل ہول لا الہ الا اللہ ولکل غم وھم ما شاء اللہ ولکل نعمۃ الحمد للہ ولکل رخاء الشکر للہ ولکل اعجوبۃ سبحان اللہ ولکل ذنب استغفر اللہ ولکل ضیق حسبی اللہ ولکل قضاء وقدر توکلت علی اللہ

[1] مناقب العارفین ص ۱۴۹ مطبوعہ ستارہ پریس آگرہ کتب خانہ حیدر آباد دکن، [2] مناقب العارفین ص ۱۱۱

ولکل مُصیبة انا للہ وانا الیہ راجعون ولکل طاعة ومعصیة لاحول

ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"،

دیوان میں یہی نغمۂ توحید بطرز دیگر ہے، نفی واثبات طریقِ سلوک ہے، کلمۂ توحید میں لا سے نفی باطل اور الا سے اثباتِ حق مقصود ہے، مولانا کی راہ یہی ہے،

لا الہ اے جان رہِ الا اللہ است ما ہم از لا تا بہ الا می رویم،

توحید وجودی مسئلۂ وحدت الوجود

وجود وقیام ذاتی رب العزت ہی کو حاصل ہے، اسی قیوم کی قیومیت سے محسوسات وعوالم امکانیہ قائم اور موجود ہیں، ہو الحی القیوم اگر ادھر سے فیض وجود نہ ہو تو سب عدم ہی عدم ہے، ع

تو خود دانی کہ من بے تو عدم باشم عدم باشم،

وجود کے چار اعتبار ہیں، اولیت آخریت ظاہریت اور باطنیت، یہ چاروں اعتبارات ذاتِ حق ہی کے ساتھ مختص ہیں، مخلوق معلومِ حق ہے، جو اپنی ماہیت میں غیر ذاتِ حق ہے، یہی معنی ہیں تشبیہ مع التنزیہ کے، سبحان اللہ وما انا من المشرکین،

ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئ علیم"،

ھو الاول ھو الآخر ھو الظاھر ھو الباطن،

بجز یا ہو و یا من ہو، کسے دیگر نمی دانم،

دوئی از خود بدر کردم یکے دیدم دو عالم را یکے جویم یکے دانم یکے بینم یکے خوانم،

توحید انیت

لا الہ الا انا کا انکشاف توحید کی نازک ترین اور اہم ترین منزل ہے، سرفرازی اور کامیابی کا یہی مقام ہے، یافت حق میں حجاب اکبر یہی ہے، خود شناسی کا محل اور اہمیت یہیں ظاہر ہوتی ہے فیہ ما فیہ[1] میں

[1] فیہ ما فیہ ملفوظات مولینا روم مطبع معارف اعظم گڈھ ص۲۱،

مولینا نے اسکی اہمیت پر بہت زور دیا ہے،

"آنچہ ہست و با او نزدیک تر از ہمہ آنست کہ آن خودی اوست او خود رانمی داند ہمہ چیز ہا را بحل وحرمت حکم می کند کہ این جائز است وآن جائز نیست واین حلال است وآن حرام است خود رانمی داند کہ حلال است یا حرام است، او جائز است یا ناجائز است، پاک است یا ناپاک است، این تجویف و زردی ونقش وتدویر بر وی عارضی است کہ چون در آتش اندازی این ہمہ نماند ذاتی شود صافی ازین ہمہ"،

آگے چل کر اس سے زیادہ وضاحت فرماتے ہیں، اور توحید انیت کے حصول کی راہ بتاتے ہیں،

"پیش او دو انائی نگنجد تو "انا" می گوئی واو "انا" یا تو بمیر پیش او، یا او بمیرد پیش تو، تا دوئی نماند اما آنکہ او بمیرد امکان ندارد، نہ در خارج ونہ در ذہن، کہ ھو الحی الذی لا یموت او را آن لطف ہست کہ اگر ممکن بودے برائے تو بمردے، تا دوئی برخاستی اکنون چون مردن او ممکن نیست تو بمیر تا او بر تو تجلی کند ودوئی برخیزد"[1]

دیوان میں فرماتے ہیں،

غبار ہاست درون تو از حجاب منی ز تو بروں نہ شود آن غبار یکبار

گر تو فرعون منی از مصر این بیروں کنی در درون خانہ بینی موسیٰ وہارون خویش

جب یہ منزلیں طے ہو جاتی ہیں تو عینیت وجودی وغیریت ذاتی کے اسرار بے پردہ ہو جاتے ہیں، اور انسان کی جامعیت معلوم ہوتی ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے،

ما زندہ بنور کبریائیم، بیگانہ او سخت آشنائیم،

توحید ارادت

توحید صفاتی میں فنائے ارادت درجۂ کمال ہے، یہ مرتبہ اس طرح حاصل ہے، کہ بندہ

[1] فیہ ما فیہ ص۲۰،

اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں فنا کر دے،

مرا گر تو چنان داری چنینم | کہ باشم من چہ باشد مہر و کینم

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کو بندے کی رضا محبوب ہو جاتی ہے، ولسوف یعطیک ربک فترضی کا راز یہی ہے، راضیۃ مرضیۃ میں اسی مقام کا اشارہ ہے، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ سے مراد یہی توحید ارادی ہے،

چو در کشاکش احکام راضیت بنید | زر نجہا برہانند و مرتفعات کنند،

جبتک سالک کو ایمان و عمل میں مرضی حق کی پیروی مقصود نہ ہو، اس کی نیکخوئی اور نکوکاری مقبول و معتبر نہیں، اسکی سعی اور اسکا عمل خبط ہو جاتا ہے،

بخوئے نیک اگر با جہاں بسازد کس | چوں خوئے حق نشناسد نہ نیکخو ست بداست

حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے،

از دل و جاں شرف صحبت جاناں غرض ست | ہمہ اینست وگرنہ دل و جاں این ہمہ نیست

فیہ مافیہ میں اس اصول کے متعلق لکھا ہے،

ایشان می پندارند کہ عمل این ظاہر است اگر منافق آن صورت عمل بجائے آرد ہیچ اورا سود ندارد چون درو معنی صدق و ایمان نیست"

(فیہ مافیہ ص ۸۲)

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم،

رہ گم نکنیم و پئے ہر غول نہ پوئیم، | جز در عقب احمد مختار نہ گردیم،

(دیوان رومی)

اتباع رسالت، توحید ہی مسلک تصوف کا مطلوب اور مقصود ہے، لیکن توحید کی کنجی رسالت ہے، بادۂ حقیقت کے مشتاقوں کے لئے رسول ہی میخانۂ غیبی کا دروازہ کھولتے ہیں، معرفت الٰہی میں مشعل راہ رسول ہی کا علم اور عمل ہی، علم حق رسول کو خدا سے ملتا ہے، اور رسول سے ساری مخلوق یہ فیض عظیم پاتی ہے، مولینائے روم نے پیغام رسالت اور اتباع رسالت پر بیحد زور دیا ہے، مثنوی اور ملفوظات تو ان مسائل کی تصریح اور تشریح سے بھرے پڑے ہیں، دیوان میں بھی اس کا پورا حق ادا کیا ہے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں، کہ صوفی کو رسول سے تعلق نہیں، صوفی کا مسلک الگ ہوتا ہے، اسے تو کفر و ایمان کی تمیز ہی نہیں، پیغمبر حق و باطل اور کفر و دین میں تمیز کرتے ہیں، وہ عارف روم کے ان اقوال کا بغور مطالعہ کریں تاکہ حقیقت روشن ہو جائے،

علم حق وحی، انبیائے کرام اپنی طرف سے تعلیمات نہیں پیش کرتے، بلکہ خدا کی طرف سے جو کچھ ان پر وحی ہوتی ہے، اس علم حق کی تبلیغ کرتے ہیں،

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ،

"چون پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم مست شدے و بیخود گشتے سخن گفتے قال اللہ آخر از روے صورت زبان او میگفت اما او درمیان نبود گوینده درحقیقت حق بود، .... پس معلوم شد کہ او نمی گوید حق می گوید کہ وما ینطق عن الھویٰ[1]،

زیں سبب قل گفتۂ دریا بود، | گرچہ نطق احمدی گویا بود،

اسلئے جو ایمان اور عمل میں رسول کا متبع نہ ہو، وہ کبھی مقصود کو نہیں پہونچ سکتا، جو خدا کا محبوب بننا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو مقبول بارگاہ بنانا چاہتا ہے، اس پر اتباع رسالت فرض ہے، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ صوفی وہ ہے جو کمال اخلاص و عرفان سے اتباع رسالت کی تکمیل کرے، سالک کو جو کچھ ملتا ہے، اسی طرح ملتا ہے، اور جو کچھ ملے گا، اسی راہ سے ملیگا، کیونکہ حضور خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم جملہ کمالات کے جامع ہیں، مولانا فرماتے ہیں،

[1] فیہ مافیہ ص ۱۴۳ و ۲۴۵، [2] مناقب العارفین، ص ۱۴۰

لطفِ خدائے جملہ کمالاتِ خلق را، — یک چیز کرد و داد بدو نام مصطفےٰ

مناقب میں مولانا نے فرمایا کہ،

"من جمیع وارثِ محمدی ام"[1]

مولینائے معنوی کے علم و عمل کی بنیاد سلطانِ اہلِ معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر ہے،

"اہلِ معنی را متابعت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم از جملہ واجبات است"،

مولینا کا فقر "فقر محمدی" ہے "فقر اشراقی نہیں" جسکو یہ دولت نصیب نہیں وہ احرار و ابرار کی جماعت ہی میں شامل نہیں ہوتا مولینا فرماتے ہیں،

"ہر کرا لذتِ فقر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم روی نمود حقا کہ از لذتِ دو جہانی و اغراض فانی اعراض کردہ و فارغ شدہ و در مسلک احرار و ابرار منخرط گشتہ"[2]

مولانا کا فقر و تصوف اشراقیین کی اشراقیت، ہندی جوگیوں کا جوگ یا عیسائی راہبوں کی رہبانیت نہیں، کیونکہ وہ مردِ حق اور متبع رسول ہیں، ان کے مسلک میں رہبانیت نہیں، بلکہ لا رہبانیۃ فی الاسلام ہے،

مسلک کی جامعیت

مولینا کا ارشاد ہے کہ دین و دنیا یکے نمی شود، مگر مردانِ حق را[3] "فیہ ما فیہ" میں بھی منشا ظاہر فرمایا ہے، اور یہی حدیث درج کی ہے، یہ مسلک نبوت کی خصوصیت ہے، کہ اس میں ظاہر و باطن کی جامعیت ہوتی ہے، اتباعِ نبوت کی وجہ سے مولینا میں بھی یہ جامعیت و حقیقت ہے، اس پر انکی زندگی بھی شاہد ہے، اور ان کے ملفوظات بھی، فیہ مافیہ میں ہے،

"ما را ہا دل بخدمت بود، اما می خواستیم کہ بصورت شرف شویم، زیرا کہ صورت نیز اعتبار عظیم دارد، چہ جائے اعتبار خود، مشارکت با مغز ہمچنانکہ کار بے مغز نمی آید[4]

[1] مناقب العارفین صفحہ ۱۴۱، [2] ایضاً صفحہ ۲۳۶، [3] ایضاً صفحہ ۵۳، [4] ایضاً صفحہ

بے پوست نیز ہم برنمی آید"،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض متصوفین جو اپنے آپ کو ظاہر کا پابند نہیں سمجھتے، اور صرف اسے کمالِ باطن خیال کرتے ہیں، کہ وہ کس درجہ سچائی پر ہیں، یہ محض افراط اور خلافِ جامعیت ہے، مولینا کے قول سے ظاہر ہے کہ کبھی انسان ظاہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، جیسے جیسے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے ظاہر باطن دونوں کے اعتبار سے مراتب اور مدارج بڑھتے ہیں، اور یہی نبوت کا رنگ ہے، اکبر مرحوم نے سچ کہا ہے،

شریعت درِ محفلِ مصطفےٰ — طریقت عروجِ دلِ مصطفےٰ،

شریعت میں ہے صورتِ فتحِ بدر — طریقت میں ہے معنیِ شقِ صدر

شریعت میں ہے قیل و قالِ حبیب — طریقت میں حسن و جمالِ حبیب،

نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ — عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ،

اب دیکھئے کہ دیوان سے جو مسلک مستنبط ہوتا ہے، اسے کس حد تک ان اعتبارات سے ربط ہے،

فرماتے ہیں کہ فقرا الی اللہ کا اقبال رحمۃ للعالمین ہی کے دم سے ہے، ع:۔

از رحمۃ للعالمین اقبال درویشان ببین،

کیونکہ عاشقانِ الٰہی کے سردار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

چون مصطفےٰ است سرور و سردار عاشقان — جملہ مطیع او شدہ چہ شاہ و چہ گدا،

اسلئے حکم ہوتا ہے کہ اگر فقر اختیار کرنا ہو، تو راہ نسبت پیغمبر اختیار کرنی چاہئے، ع

فقر بگزیں راہ رو کاں سنت پیغمبر است،

کفر کی سیاہی نور محمدی ہی سے دور ہوتی ہے،

جامہ سیاہ کرد کفر نور محمد رسید، طبل بقا کوفتند ملک مخلد رسید

رند پاکباز جب کبھی شراب حقیقت کا جام نوش فرماتے ہیں، تو وسیلہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا لیتے ہیں،

پاکان راہ فقر ز خمخانہ الست جامے چو در کشند دم از مصطفےٰ زنند

رسالت کی پیروی ہی سے انسان صراط مستقیم پر رہتا ہے، دوسرے طریقے غولان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے سالک گمراہ ہوتا ہے،

رہ گم نہ کنیم وپے ہر غول نہ پوئیم جز در عقب احمد مختار نہ گردیم

کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے میخانہ غیبی کا دروازہ کھولا ہے، ع

بکشاد محمد درمے خانہ غیبی

مقصود اتباع نور محمدی ہی سے حاصل ہوتا ہے، ان کے آگے اپنے خیالات وخطرات کے اصنام توڑ دینے چاہئیں، ورنہ شرک فی الامر ہو جائے گا،

ما چند صنم پیش محمد بشکستیم تا در صنم دلبر ودلخواہ رسیدیم

فلک پیما وشب بیدار باشم طریق احمد مختار از اختر بگیرم،

مولینا کے سلسلۂ طریقت کے قافلہ سالار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

بخت جوان یار ما دادن جان کار ما قافلہ سالار ما فخر جہان مصطفےٰ،

لا تموتن الا وانتم مسلمون کی فضیلت انہی اصحاب کو حاصل ہوئی، جو اخلاق مصطفوی کو اپنا شعار بناتے ہیں،

وان کہ اخلاق مصطفےٰ جویند، چون ابو بکرؓ چون عمرؓ میرند،

دامن محمدی سے اپنے آپ کو حضرت بلالؓ کی طرح وابستہ کرنا چاہئے،

ردائے احمد مختار برگیر اے عاشق صلائے عشق شنو ہر دمے ز روح بلال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار سے جہل حقیقت اور کفر پیدا ہوتا ہے،

گر جاحد ایزدم جہولم، ور منکر احمدم جہودم،

ترقی اس نے کی جو بندۂ دین وکیش ہوا، کیونکہ تصوف عین منشائے شریعت کی حسن وکمال واخلاص کیساتھ تکمیل کا نام ہے،

اے خنک آنکہ پیش شد بندۂ دین وکیش شد موسی وقت خویش شد جانب طور میرود

پیر کی رہنمائی، علم وعمل کی ہر شاخ میں رہنمائی کی ضرورت ہے، ورنہ حیات علمی کی تعمیر ممکن نہیں اسی طرح دین میں بھی ہادی ورہنما کی ضرورت ہے، دین کے ظاہر وباطن دونون پہلو ہیں، اسلئے کمال ایمان اور صاحب صفا بننے کے لئے ایسے آدمی کی صحبت اور ہدایت کی ضرورت ہے جس کا ظاہر وباطن آراستہ ہو، ایسے ہی شخص کو مرشد یا پیر کہتے ہیں، ہر اس انسان پر جو اخلاص اور صفا کا کمال حاصل کرنا چاہتا ہے، ایسے رہنما کی تلاش لازم ہے، وابتغوا الیہ الوسیلۃ کونوا مع الصادقین، واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ (کھف)

سلوک الی اللہ کی اولین شرط یہی ہے کہ کوئی پیر حق پرست نصیب ہو، مولینا کا فرمان ہے،

"آدمی میباید کہ آن تمیز خود را عاری از غرضہا کند، ویارے کہ جوید، در دین کہ دین یار تناسبت"[1]

مناقب[2] میں مولانا کا قول درج ہے،

"بدانی کہ بے تربیت شیخ ہیچ تربیتے نیست وہر طاعت بے براست وبے نور است من

لا شیخ لہ لا دین لہ

ہیچ نہ کشد نفس را جز ظل پیر، دامن آن نفس کش را سخت گیر،

[1] فیہ مافیہ ص ۱۱، [2] مناقب العارفین ص ۱۵۶،

دیوان میں مولینا نے اس مسئلہ پر انہی خیالات کا اظہار کیا ہے،

بے دولت مخدومی شمس الحق تبریز — نے ماہ توان دیدن نے بحر توان شد

شمس الحق تبریزی صد گونہ کند دل را — گاہیش کند تیغش گاہیش سپر سازد

لیکن پیر کی صفت اور اس کا معیار یہ ہو کہ وہ ہم نفس مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور انوار مصطفوی سے اسکا دل منور ہو،

رسد بفیض تجلی شمس تبریزی — دلے کہ نور ز انوار مصطفےٰ دارد

شاہ شہے بخش جان مفخر تبریزیان — آنکہ در اسرار عشق ہم نفس مصطفےٰ ست

در ہوائے شمس تبریزی ز ظلمت درگذر — ناگہان سر برزنی در نور سبحان مجیبی

علماے امت انبیا کے وارث ہوتے ہیں، بلکہ ان کی مثال انبیاے بنی اسرائیل کی سی ہے اسلئے مولینا مرشد کو نبی وقت سے تعبیر فرماتے ہیں، حضرت شمس کے متعلق لکھا ہے،

بکشادند خزینہ ہمہ خلعت پوشید،

مصطفےٰ باز بیامد ہمہ ایمان آرید،

عشق پر مسلک کمال منحصر ہے۔

تقریر بالا سے یہ ظاہر ہے کہ مولینا کا تصوف، ان کا فلسفۂ حیات اور انکا مسلک یہی ہے، کہ توحید کے مراتب بکمال حاصل کئے جائیں، اور حصول مقصد کی راہ یہی ہے کہ علماً اور عملاً رسول کی پوری پوری اتباع کیجائے، اپنے دین کو خدا کے لئے خالص کیا جائے، اپنے اندر کمال اخلاص اور تسلیم پیدا ہو، نماز و عبادت میں جس طرح اپنا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح قلب بھی ہر وقت حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے،

ان کمالات کے حصول کے لئے ضروری ہو کہ ایسے شخص کی ارادت اور صحبت اختیار کیجائے جو ان مراتب ایمانی کو حاصل کر چکا ہو اور وہ انوار نبوت سے مستنیر ہو، لیکن مولینا کی نظر میں اصولاً

سلوک کی کوئی منزل بغیر درد طلب، عشق و محبت، تڑپ اور بے چینی کے طے نہیں ہو سکتی، جبتک دل میں محبت کا بیج نہ ہو ایمان کا درخت پھل نہیں لا سکتا، اخلاص و رضا کا سمندر کشتی عشق ہی کے ذریعہ پار کیا جاتا ہے، فیہ ما فیہ میں ارشاد ہوتا ہے،

"درد یست کہ آدمی را رہبر است، در ہر کارے کہ ہست تا او را درد آن کار، ہوس و عشق آن کار در درون نخیزد، او قصد آن کار نکند و آن کار بے درد او را میسر نشود خواہ دنیا و خواہ آخرت خواہ بازرگانی خواہ بادشاہی خواہ علم خواہ عمل،

دیوان میں بھی مولانا نے عشق کا یہی مقام قرار دیا ہے، اور اسکی ایسی ہی اہمیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ عشق ہی باعث کائنات اور مقصودِ تخلیق ہے، ع

نخست از عشق او زاد آدم آخر دل بدو دادم

عشق سے مقصود عبدیت اور بندگی ہے،

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی، — کفر باشد پیش او جز بندگی،

عشق کی اہمیت،

جہان درخت عمل برگ و میوۂ او عشق — چو برگ و میوہ نباشد شجر چہ سود کند

عشق معراج است سوے بام سلطان جمال — از رخِ عاشق فرو خوان قصۂ معراج را

زندگی کی آخری سانس بھی اسی عشق کے پیدا کرنے میں صرف ہونی چاہئے، ع

ترا اگر نفسے ماند غیر عشق مجوے،

عشق ہی کا اندیشہ جہاد اکبر ہے، کیونکہ اس کی کشمکش اندیشۂ باطن کے ساتھ ہے، اس کا مقابلہ نفس کے ساتھ ہے، کیونکہ محبوب حقیقی کی محبت کو ماسوا کی محبت پر غالب کرنا پڑتا ہے، اور ہر فعل کو مرضی حق کے تابع کرنا پڑتا ہے، اسے نور الٰہی سے دیکھنا پڑتا ہے،

"چوں تمام اورا ایمان حقیقی باشد، او ہمہ فعل کند کہ حق خواہد" (فیہ مافیہ ص۱۳۶)

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر یعنی با نفس مصاف کردن جہاد اکبر است،

(فیہ مافیہ ص۶۴)

نتیجہ اور استقامت، یہ راہ بڑی کٹھن ہے، اس کوچہ میں صرف پائے ثبات ہی کو اذن سیر ہے، اور وہی آستانہ جاناں تک پہنچ سکتا ہے، جو صاحب استقامت ہے، اسی راہ کے اختیار کرنے سے انسان اپنے شرف و عظمت کے اصلی مقام پر پہنچتا ہے، اسی طریق میں اس کا نشانہ خدا پر ہوتا ہے، خلافت الٰہیہ کی منزل تک اسے رہنمائی ہوتی ہے، اور جب اس نے اپنے آئینہ کو غیریت کے گرد و غبار سے صاف کیا ہے، تو ہمیشہ جمال الٰہی اس میں منعکس ہوتا ہے، (دیوان کے اشعار فیہ مافیہ سے ملفوظات کی مطابقت کیساتھ درج کئے جاتے ہیں،)

"وجود آدمی اصطرلاب حق است، چوں اورا حق تعالیٰ بخود عالم و دانا و آشنا کرد وبا شد
ان اصطرلاب وجود حق خود تجلی حق را و جمال بیچون را دمبدم و لمحہ لمحہ می بیند وہرگز آن جمال
ازین آئینہ خالی نباشد" (فیہ مافیہ ص۱۳)

مومن کمال ایمان کے باعث آئینۂ مومن (اسم اللہ) بنجاتا ہے، مولینا کے متعلق افلا کی کا قول ہے، کہ

"در معنی المومن، مرأت المومن لطائف می فرمود گفت اللہ را یک نام مومن است و بندہ را
ہم مومن المومن مرأۃ المومن یعنی تجلی فیہا رتبہ یعنی در بندہ مومن اللہ مومن تجلی میکند تو اگر رویت اللہ
بخواہی، در آن مرات در انا مینی آنچہ بینی،

آہن من صیقل عشقش چو یافت   آئینہ گون رفت از وے آہنی

(مناقب العارفین ص۳۰۹)

نہ ز بویم نہ ز رنگم نہ ز جسمم نہ ز جانم   حذر از تیر خدنگم کہ خدائیست کمانم

حق تعالیٰ انفس مومن کا خریدار ہوتا ہے، اس کی قیمت ذات اور صفات کے سارے فیوض ہیں، جسے جنت کہتے ہیں، جو ان برکات کے ظہور کا محل اور مقام رضا ہے "حق تعالیٰ ترا قیمت عظیم کردہ است، ومی فرماید کہ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ،

تو بہ قیمت برابر جانی،   چہ کنم قدر خود نمی دانی،

(فیہ مافیہ ص۱۱)

نتیجہ سلوک بقا باللہ، عاشق "ترک نفی خودی" کرچکا ہے، اب اثبات مطلق کی طرف سے اثبات دوام حاصل ہوگا، اسی کو بقا باللہ کہتے ہیں، یہی حاصل فنا ہے،

خیال ترک من ہر شب صفات ذات من گردد   مرا نفی من در دے ہمہ اثبات من گردد،

یہی حیات بعد الممات کا احسن ترین مرتبہ ہے، عارف عاشق اسی لئے موت سے بے خوف ہوتا ہے، کہ موت اس کے لئے راہ وصال اور رفع حجاب ہے، مولینا نے اس اصول اور اسی خیال کو ایک غزل میں تشریحاً بیان فرمایا ہے،

بروز مرگ چو تابوت من روان باشد   گمان مبر کہ مرا میل این جہان باشد
جنازہ ام تو چو بینی مگو فراق فراق   مرا وصال و ملاقات آنزمان باشد
فرو شدن چو بہ بینی بر آمدن بنگر   غروب شمس و قمر را چرا زیان باشد
کدام دلو فرو شد کہ ز آب در نامد
ز چاہ یوسف جان را چرا زیان باشد

الحمد للہ کفیٰ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ،

کلام خواجہ سنائی غزنوی

از

جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

ستمبر سنہ حال کے معارف میں یہ مژدہ نظر سے گذرا کہ افغانستان کے ادیب فاضل سرور خان گویا نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت نادر و قدیم مجموعہ دریافت کیا ہے، اگرچہ معارف کے فاضل مدیر نے اس انکشاف پر خوش ہونے کا حق "فضلاے ہندوستان" کے لئے مخصوص فرما دیا ہے، تاہم شرح ناداں شروانی بھی بیحد خوش ہوا، دو وجہ سے، اوّل ایک بیش بہا علمی سرمایہ کی یافت پر، دوم اپنے وطن کے اس فخر پر کہ وہاں وہ گوہر شاہوار تاباں ہوا جس سے ایران کا دامن خالی نکلا، ہر چند شروانی کے بزرگوں کو نواحِ قندھار سے آئے ہوئے پانسو برس ہو چکے، تاہم بحمد اللہ حبِ وطن کی چنگاری ہنوز سینے میں زیر خاکستر دبی ہے، فرطِ فخر میں جب بے مایہ شروانی نے اپنی گدڑی کو ٹٹولا تو الحمد للہ چند لعل بے بہا اس میں سے بھی نکلے، معارف پرور قلوب کی ضیافت کے لئے ذیل میں انکے جوہر نمایاں کرتا ہوں، یہ ضیافت مدیرِ معارف کی صحت یابی کی نذر تصور فرمائی جائے،

حبیب گنج کے کتابخانے میں چھ نسخے کلام سنائی کے ہیں، دو مطبوعہ، چار قلمی،

مطبوعہ میں :-

۱- پہلا نسخہ مثنوی حدیقہ سنائی کا ہے، جو ۱۳۰۵ء میں مطبع نولکشور میں چھپا تھا، اس میں خاص بات وہ دیباچۂ نثر ہے، جو خود سنائی نے حدیقہ پر لکھا تھا، مطبع نے اسکو شارح حدیقہ و مثنوی معنوی خواجہ عبد اللطیف عباسی کی شرح سے نقل کرکے فیض عام کر دیا ہے، دوسری خاص بات یہ ہے کہ خواجہ موصوف کی شرح حدیقہ مسمّیٰ بہ لطائف الحدائق حاشیہ پر چڑھا دی ہے، شارح عباسی نے شرح کے مقدمے میں نسخہ حدیقہ کے اہتمام تصحیح کی تشریح کرتے ہوئے، اُس نسخہ کا ذکر کیا ہے جو دور اکبری کے امیر عزیز خان کوکلتاش نے حکیم سنائی کے مزار سے حاصل کیا تھا، اور جو عہدِ مصنف کے قریب ہی زمانہ میں لکھا گیا تھا، مطبوعہ نسخہ جلی قلم خوشخط ہے،

۲- دوسرا نسخہ مطبوعہ وہ ہے جو نواب علاؤ الدین خاں علائی مرحوم والی لوہارو نے اپنے مطبع فخر المطابع واقع لوہارو میں چھپوایا تھا، خود تصحیح کی تھی، خود شرح بھی لکھی تھی، جس کا نام ہے طریقہ بر حدیقہ، جو حاشیے پر چڑھی ہوئی ہے، یہ سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی، ایک خاص لطف اس نسخے کا یہ ہے کہ علائی مرحوم کی طرف سے قاضی حسام الدین سکندر آبادی کو ہدیۃً بھیجا گیا تھا، یہ نسخہ صرف مقصد اول تک چھپا ہے،

قلمی چار نسخوں میں :

۳- ایک نسخہ مثنوی حدیقہ کا ہے، یہ نسخہ سنہ ۱۰۳۶ھ کا لکھا ہوا ہے، مقابلہ شدہ ہے،

۴- دوسرا قلمی مجموعہ قصائد وغیرہ کا ہے، جو بلحاظ خط و کاغذ نوادر میں سے ہے، سنہ ۱۰۰۵ھ میں امام علی کرمانی نے لکھا تھا، پورے ساڑھے چار سو برس گذر جانے پر بھی کاغذ کی آب و تاب اور مضبوطی قابل دید ہے، اس میں پانسو چوبیس ۵۲۴ صفحے ہیں، ان میں سے ۵۰۸ صفحوں پر قصائد و غزلیات ہیں، ۱۶ صفحے ہجویات کے ہیں، ہجو کے بعد مرثیے ہیں، مرثیوں کے بعد مقطعات مقطعات کے بعد رباعیات رباعی میں یہ بات قابل لحاظ ہے، کہ ردیف و قافیہ چاروں مصرعوں میں یکساں ہے، رباعیات پر نسخہ ختم ہو جاتا ہی،

۵- تیسرا قلمی مجموعہ جسکا حجم چھ سو چھ ۶۰۶ صفحات کا ہے، سنہ ۱۰۱۲ھ میں بمقام آگرہ لکھا گیا،

کاتب کا نام نہیں،

اس مجموعے میں اول قصائد ہیں، جو حمد، نعت، الزہد والحکمۃ اور مدح میں ہیں، قصائد کے بعد غزلیات ہیں (جو ردیف وار مرتب نہیں) غزلیات کے بعد معمیات، ہجویات قطعات و رباعیات ہیں، اس حصّے کا نام الحدائق فی الخلائق ہے، دوسرا حصہ جو مستقل رسالے کی شکل میں ہے المسمّی "بہ کارنامہ از بلخ بہ غزنین فرستادہ"، تیسرا حصہ مثنوی مسمّی بہ سنائی آباد و حدیقۃ الحدیقہ، چوتھا حصہ مثنوی کنوز الرموز، اس مثنوی سے پہلے ایک قصیدہ شیخ الاسلام محمد بن منصور کی مدح میں ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کے بعض حصّے اوّل و آخر سے کم ہیں، اسلئے کہ اسکی ابتدا اگرچہ بسم اللہ سے ہے، تاہم شروع کا عنوان ہے، "قسم دوم در توحید رب العالمین جل جلالہ" آخری حصّے کا عنوان ہے "قسم دہم مثنویات، اول کنوز الرموز، سیر العباد الی المعاد و مراتب حال انسانی" آخر کی دو مثنویاں مجموعۂ ہذا میں نہیں ہیں، صرف کنوز الرموز ہے،

۴- چوتھا قلمی حصہ "مکاتیب سنائی" کا ہے، تقطیع چھوٹی، خوشخط نسخ، ۱۲ خط ہیں، ایک خواجہ احمد بن مسعود کے نام جن کی فرمایش سے حکیم سنائی نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا، ایک خط خواجہ قوام الدین وزیر عراق کے نام ہے، ایک حکیم عمر خیام کے نام، باقی علی ہذا القیاس، حکیم عمر خیام کے القاب میں فرید الزمانی فریح الدہر لکھا ہے، درمیان خط میں ایک جگہ پیشوائے حکیماں کے لفظ سے خطاب کیا ہے، مکاتیب کی تحریر کا سنہ اور کاتب کا نام درج نہیں، خط اور کاغذ کے انداز سے نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے،

ابو العلاء و ما الیہ

عربی زبان میں خیام عرب ابو العلاء کے حالات و سوانح اور اس کے مساعی پر بہترین تبصرہ،

حجم ۴۲۴ صفحے، قیمت مجلد ے، غیر مجلد ۱۲ر، مطبوعہ مصر،

"منیجر"

اسلام سوڈان میں[1]

مترجمہ

مولوی محمد یوسف صاحب فاضل دار السلام عمرآباد (مدراس) رفیق دار المصنفین،

اسلام کا مولد و منشا ایشیا ہے، اور سوڈان افریقہ کا ایک ٹکڑا ہے، جو نیل کی وادی سے ملا ہوا ہے، پھر اسلام سوڈان کے دور دراز علاقہ میں کب اور کیسے پہنچ گیا، اور وہاں کی اجتماعی زندگی پر اسکا کیا اثر پڑا،

انگریزی مصری سوڈان افریقہ کا وہ علاقہ ہے، جو شمال و جنوب میں وادی حلفا کے شمالی شہر فرس اور وکٹوریا، اور نیانزا کی جھیلوں کے مابین اور مشرق و مغرب میں بحر احمر کے ساحل اور سلطنت وداعی کے درمیان واقع ہے،

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ علاقہ حبشۂ زیریں کی سلطنت میں شامل تھا، جو قدیم مصری، ایرانی، یونانی اور رومی سلطنتوں کے معاصر تھی، اسکے دو پایۂ تخت تھے، ایک شہر نبتہ جو نیل کے پورب چوتھی آبشار کے قریب برکل پہاڑ کے کنارے پر واقع ہے، دوسرا شہر مروی جو موجودہ زمانہ کے حلۃ البجراویہ کے قریب شمالی شہر شندی سے تقریباً پچاس کیلومیٹر دور واقع ہے، حبشہ کی یہ سلطنت رومی سلطنت کے آخری زمانہ یعنی ۶۴۰ئہ تک قائم رہی، جس کے بعد اس کے دو ٹکڑے ہو گئے،

۱- مملکت نوبہ، جو نیل کے کنارے پہلی آبشار اور حبشہ کے درمیان واقع تھی،

۲- مملکت بجہ جو مشرقی صحرا میں قائم تھی،

قدیم مصریوں کی طرح ان دونوں مملکتوں کا مذہب بھی بت پرستی تھا، جب ۵۴۵ئہ کے قریب

[1] ترجمہ از الفتح مصر مورخہ ۱۸ر جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ

مصر میں نصرانیت کا ظہور ہوا تو اسکندریہ کے نصرانی داعی مسیحیت کی تبلیغ کی غرض سے نوبہ کے علاقوں میں پہنچے، اور وہاں کے باشندوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور مذہب عیسوی کے قبول کرنے کی دعوت دی، چنانچہ تمام نوبیوں نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور بت پرستی کے بجائے دین عیسوی کو اپنا مذہب قرار دیا،

اس کے بعد نوبہ میں نصرانیوں کی دو سلطنتیں ہوگئیں، ایک نوبۂ زیریں جو پہلے اور چوتھی آبشار کے درمیان واقع تھی، اس کا پائے تخت دنقلا العجوز تھا، جو نیل کے پورب موجودہ دارالحکومت دنقلا کے جنوب میں واقع ہے، دوسری نوبۂ بالا جس کو مورخین اسلام مملکت علوہ اور سوڈانی مملکت تنج کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو تھی آبشار اور شہر سنار کے درمیان پھیلی ہوئی تھی، اس کا پایۂ تخت شہر سوبہ تھا، جو نیل ازرق کے دائیں کنارے شہر خرطوم سے تقریباً ۲۴ کیلومیٹر دور جنوب میں واقع تھا،

مسلمانوں نے ۲۰ھ مطابق ۶۴۱ء میں مصر کو فتح کیا، اسکے بعد ہی سے مشرقی صحرا کی مملکت بجہ کے باشندوں کے ساتھ عربوں کا میل جول شروع ہوگیا، انھوں نے ان کو اسلام کی تعلیم دینی شروع کی، چنانچہ وہاں کے باشندوں نے اسلام تو قبول کرلیا، مگر ان میں ضعیف الاعتقادی اب تک موجود تھی، جیسا کہ آگے آئے گا،

فتح مصر کے بعد سے مسلمان عرب نوبہ کی دونوں سلطنتوں میں بھی آنے جانے اور وہاں کے لوگوں کو بتدریج اسلام میں داخل کرنے لگے تھے، یہانتک کہ ۲۱ھ میں مسلمانوں کو ایک چھوٹی سی جبری لڑائی لڑنی پڑی، اس میں عرب بری طرح مجروح ہوئے، اور آنکھیں ضائع کرکے لوٹے، کیونکہ نوبہ کے باشندے بہت اچھے تیر انداز تھے، چنانچہ مسلمانوں نے ان کا نام ہی رماۃ الحدق یعنی "آنکھوں پر تیر چلانے والے" رکھ دیا تھا،

لڑائی کے اس برے نتیجہ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بہت ہی برانگیختہ کردیا، انھوں نے

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی سرکردگی میں نوبۂ زیریں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بیس ہزار کا ایک لشکر روانہ کیا، ایک زمانہ تک یہ لشکر وہاں پڑا رہا، آخر حضرت عمرو بن العاصؓ کی طلبی پر نوبہ کی مملکت سے یہ صلح کرکے واپس چلا آیا، کہ وہ سالانہ مصر کے والی کو ایک مقرر رقم بھیجا کرے گی،

اس کے بعد حضرت عمر بن الخطابؓ کی شہادت اور حضرت عثمانؓ کی خلافت اور حضرت عمرو ابن العاص کی معزولی، اور ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی تولیت مصر کا واقعہ پیش آیا، نوبہ نے فوراً صلح توڑ دی، اور نوبیوں کی ایک جماعت نے صعید مصر پر تاخت و تاراج کی، اسلئے عبداللہ ابن سعد بن ابی سرح نے دوسری مرتبہ ان سے جنگ کرنے کا عزم کرلیا، اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ یعنی ۳۱ھ میں ایک عظیم الشان لشکر کیساتھ دنقلا العجوز کا سخت محاصرہ کرلیا، اور منجنیق کے ذریعہ ان پر پتھر پھینکنا شروع کیا، اہل نوبہ منجنیق چلانا نہیں جانتے تھے، جب ان کا کلیسا ان پتھروں سے تباہ ہونے لگا، تو وہ ڈر گئے، ان کے سردار قلیدروں نے صلح کی درخواست کی، اور خود عاجزی اور مسکنت کیساتھ عبداللہ بن سعد کے سامنے حاضر ہوا، انھوں نے اسکی بڑی تعظیم و تکریم کی، اور اس کے مرتبہ کو بلند کیا، اور سالانہ تین سو ساٹھ غلاموں کی ادائگی پر اس سے صلح کرلی، اور اس سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ سالانہ اناج بھیجا کریں گے، کیونکہ قلیدروں نے ان سے اپنے ملک میں اناج کی قلت کی شکایت کی تھی، عبداللہ بن سعد نے جو صلح کی تھی وہ حسب ذیل ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"امیر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی طرف سے نوبہ کے سردار اور اس کی مملکت کے تمام باشندوں کے لئے یہ عہد ہے کہ جس کی تعمیل اسوان سے لیکر ارض علوہ تک نوبہ کے ہر چھوٹے اور بڑے آدمی پر فرض ہے، عبداللہ بن سعد نے تمھارے لئے امان، اور تمھارے اور مسلمانوں اور اہل ذمہ کے درمیان صدقہ جاریہ مقرر کیا ہے، اے نوبہ کے باشندو! تم

اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امان میں ہو، ہم اسوقت تک تم سے جنگ نہیں کریں گے جب تک تم ہمارے اور اپنے درمیان کی ان شرطوں پر قائم رہوگے، کہ تم ہمارے شہروں میں داخل ہوگے، مگر اقامت نہیں اختیار کروگے، جو مسلمان یا معاہد تمہارے شہروں میں داخل ہوگا، ان کے واپس ہونے تک تم ان کی حفاظت کروگے، ہر اُس غلام کو جو مسلمانوں کے پاس سے بھاگ کر تمہارے پاس آئے، اسکو مملکت اسلام کی طرف لوٹا دوگے، اس کی سرپرستی یا چاپلوسی قبول نہ کروگے، اور نہ اس مسلمان کو منع کروگے، جو غلام کو گرفتار کرنے کے لئے تمہارے شہروں میں آیا ہے، تم پر اس مسجد کی حفاظت لازمی ہے، جس کو مسلمانوں نے تمہارے شہر میں تعمیر کیا ہے، اور کسی نماز پڑھنے والے کو اس مسجد سے نہ روکوگے اور تم پر اس مسجد کی تزیین وتکریم بھی ضروری ہے، تم پر واجب ہے کہ سالانہ تین سو ساٹھ غلام جو اوسط درجہ کے ہوں اُن میں کسی قسم کا عیب نہ ہو، مرد وعورت دونوں ہوں، بالکل بوڑھے یا بچے نہ ہوں، اسوان کے والی کو بھیجا کرو، ارض علوہ سے اسوان تک کے کسی مسلمان پر یہ ضروری نہیں کہ تمہارے دشمن کو دفع کرے، اگر تم نے کسی مسلمان کو پناہ دی یا کسی مسلمان اور معاہد کو قتل کیا، یا کسی مسجد سے تعرض کیا، جس کو مسلمانوں نے تمہارے شہر میں تعمیر کیا ہے، یا تین سو ساٹھ غلاموں کے روانہ کرنے میں کچھ کمی کی، تو اس سے یہ صلح وامان بالکل بری ہے، ہم نے اور تم نے اس پر یکساں وعدہ کیا ہے، یہانتک کہ اللہ تعالٰی ہمارے درمیان فیصلہ کرے، اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، اسی پر خدا کا عہد اور میثاق ہے، اس کا اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، اور ہمارے لئے تم پر مسیحؑ حواری اور تمہارے دین وملت کے بزرگوں کا ذمہ ہے، اور اس پر ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ تعالٰی گواہ ہے، عمر بن شرحبیل نے رمضان ۳۱ھ میں اسکو لکھا"

اس جزیہ کا نام جو نوبہ کی حکومت سالانہ ادا کرتی تھی، "بقط تھا"، یہ بقط ہمیشہ وصول ہوتا رہا، یہانتک کہ تمام نوبہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا، "بقط" کی یہ مقدار بیت المال کے لئے تھی، اسکے علاوہ امیر مصر کے لئے چالیس غلام، والی اسوان کے لئے جو بقط وصول کرتا تھا بیس، اسوان کے حاکم کے لئے جو بقط کی وصولی کے وقت حاضر ہوتا تھا پانچ اور اسوان کے بارہ[۱۲] انصاف پسند گواہوں کے لئے جو حاکم کے ساتھ آتے تھے، ہر ایک کو ایک غلام کے حساب سے بارہ غلام مقرر تھے، اس جگہ کا نام جہاں بقط لیا جاتا تھا "قصر تھا" جو اسوان سے چھ میل دور تھا،

یہ جو کچھ تھا، نوبۂ زیرین کے متعلق تھا، لیکن نوبۂ بالا جو مورخین اسلام کے نزدیک مملکت علوہ اور سوڈانیوں کے نزدیک مملکت فنج کہلاتی تھی، طلوع اسلام کے زمانہ ہی سے عربوں کی ہجرت گاہ بنی ہوئی تھی، ہجرت کا راستہ اکثر مصر سے ہوتا تھا، اور سمندر سے بہت کم، اسکے اسباب اجتماعی تھے، جیسے حکام کے ظلم سے فرار ہونا، یا رزق کی طلب میں نکلنا، یا سیاسی ودینی حقوق کی پائمالی کی وجہ سے ہجرت کرنا، ان کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا یعنی قول وعمل سے اسلام کی تبلیغ کا جذبہ،

جب والی مصر اور نوبہ زیریں کے درمیان اتحاد ہوگیا، تو ہجرت کے لئے جگہ نکل آئی، اور عرب کثرت سے سوڈان کی طرف ہجرت کرنے لگے، عربی قبائل میں جن قبیلوں نے بہت زیادہ تعداد میں ہجرت کی وہ جہینہ اور بنو عباس تھے، نوبی عنصر پر عربی عنصر کے غالب ہوجانے کے باوجود سارے شہر شاہ فنج ہی کے فرمانبردار رہے، یہانتک کہ سنار کے فرنگیوں نے بغاوت کی، اور عربوں کو ساتھ لیکر فنج کے شہروں پر حملہ کیا، اور بے دریغ ان کا خون بہایا، اور مملکت علوہ کے پائے تخت سوبہ کو ایسا تباہ وبرباد کیا کہ سوڈان میں وہ ضرب المثل بن گیا، پھر انھوں نے مملکت فنج کے دوسرے پائے تخت شہر قری پر چڑھائی کی، اور وہاں کے بادشاہ کو قتل کرکے شہر پر قبضہ کرلیا، اور سنار میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، عربوں نے بھی شیخ کے لقب سے ایک شخص کو اپنا سردار مقرر کیا، اور شہر

قری کو اپنا مرکز قرار دیا، اس طرح سے اسلام نوبہ کے زیرین اور بالا دونوں حصوں میں پھیل گیا، اور نیل کے اطراف پہلی آبشار سے لیکر فازوغلی کی پہاڑیوں تک اور نیل ازرق وارض جزیرہ کا پورا ملک خالص اسلامی بنگیا،

۷۱۰ھ مطابق ۱۳۱۰ء تک اسلام نے نوبۂ زیریں کے پورے ٹکڑے کو گھیر لیا، اور ہم کو معلوم ہے، کہ وہاں ۲۱ھ میں اسلام داخل ہوا تھا، اور پورے نوبہ بالا کو ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۵ء میں اسلام نے اپنا حلقہ بگوش کرلیا،

حبشۂ زیریں کی دوسری مملکت جو بجہ کے نام سے مشہور تھی، اور جس کے متعلق ہم نے پہلے اشارہ کیا تھا، کہ وہاں اسلام ان عربون کے ساتھ داخل ہوا تھا، جو ۲۱ھ کی فتح مصر کے بعد وہاں آنے جانے لگے تھے، اور اہل بجہ کیساتھ عربوں کا میل جول شروع ہوا تھا، یہ مملکت اسلام کے پہلے صابی تھی، اسکے باشندے بت پرست تھے، ان میں کے ہر ایک قبیلہ کا ایک کاہن ہوتا تھا، جس کے لئے چمڑے کا ایک خیمہ بنا دیا جاتا تھا، اور یہی خیمہ ان کا معبد بھی تھا، جب کبھی اس کاہن سے ایسے امر کے متعلق جس میں غیب کی بات معلوم کرنی ہوتی، خبر دریافت کیجاتی، تو وہ تنہا پیٹھ کی طرف سے خیمہ میں داخل ہوجاتا، پھر ایسی حالت میں باہر آتا، کہ اس پر ہذیان واضطراب یا صرع کی سی کیفیت طاری رہتی، اور وہ لوگون سے کہتا کہ شیطان نے تم کو سلام کہا ہے، اور ایسا اور ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ لوگ اس کو سچ جانکر اس پر عمل کرتے تھے،

۳۱ھ میں جب عبد اللہ بن سعد نوبہ کی لڑائی سے واپس آئے، تو بجہ کی ایک جماعت جو ضعیف الاعتقادی کیساتھ شرف اسلام سے مشرف ہوئی تھی، ان کے پاس آئی، اور ان سے اپنی اور اپنے ملک کی پوری حالت بیان کی مگر عبد اللہ نے کچھ توجہ نکی، اور نہ ان سے کوئی صلح کی، ان کو انکی حالت پر چھوڑ دیا، اس حالت میں کہ ان کا ایمان کمزور تھا، اور اسلام ان کے دلوں کی تہ تک نہیں پہنچا تھا، انھون

نے کسی لشکر کے دباؤ سے اسلام نہیں قبول کیا تھا، بلکہ اجتماعی یا ذاتی رغبتوں سے اسلام کو مان لیا تھا، انکے نام بالکل ملے جلے تھے، ان کا تدین محدود اور ضعیف تھا، یہانتک کہ پہلی صدی ہجری کے اخیر میں عبد اللہ ابن حجاب سلولی نے ان سے ان شرطوں پر صلح کرلی، کہ وہ ہر سال تین سو اونٹ دیا کریں گے، سواحلِ مصر میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوں گے، وہاں اقامت نہیں اختیار کرین گے، کسی مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کریں گے، اگر کسی کو قتل کیا، تو پھر ان کے لئے کوئی عہد نہ ہوگا، نیز مسلمانوں کے بھاگے ہوئے غلامون کو پناہ نہیں دیں گے، اور جب ان کے شہرون میں فرار شدہ غلام آئیں گے، تو اُن کو واپس کر دیں گے، اور ان کا ایک وکیل سواحلِ مصر میں مسلمانون کے پاس بطور رہن کے رہا کرے گا،

لیکن بجہ کی مملکت اس صلح پر قائم نہ رہی، بلکہ مسلمانون کو اذیت پہنچانے لگی، اس زمانہ میں اسوان کے والی عراق سے مقرر کئے جاتے تھے، اسلئے اسوان کے والی نے خلیفہ مامون عباسی کو تمام حالات سے مطلع کیا، اس نے ۲۱۶ھ میں عبد اللہ بن جہم کو اس سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا، عبد اللہ نے اس کے ساتھ بہت سی خونریز لڑائیاں لڑیں، یہانتک کہ وہ صلح کی طالب ہوئی، چنانچہ کنون بن عبد العزیز نے بجہ کے سردار اور عبد اللہ کے درمیان ایک طویل صلحنامہ لکھا، جس کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانون کی حفاظت کی پوری بندش کی گئی، اور یہ ثابت کیا گیا کہ انکی پوری مملکت یعنی اسوان سے لیکر دھلک و باضع تک جو کچھ ہے، وہ خلیفہ مامون کی ملکیت ہے، اور اس کی رعایا امیر المومنین کی غلام ہے، اگر وہ پہلے کے مانند اب بھی بجہ کا سردار اس شرط پر بھی رہے گا، کہ وہ سالانہ سو اونٹ یا تین سو دینار مسلمانون کے بیت المال میں داخل کرے، نیز امیر المومنین اور اسکے والیون کو اس کی مملکت پر تصرف کرنے کا پورا اختیار ہوگا، اور جو شخص نبی کریم صلعم، قرآن مجید اور مذہب اسلام کی شان میں گستاخی کرے گا، اہل حرب کے مانند اس کا خون بھی حلال ہوگا، ان کے علاوہ اور بھی

شرائط تھے، جن کی وجہ سے وہاں سلطانِ اسلام کا اقتدار بڑھ گیا،

۲۳۲ھ تک بجہ کی مملکت اس صلح پر قائم رہی، اس کے بعد وہاں کے باشندوں نے اس عہد کو توڑ دیا، اور سواحلِ مصر پر حملہ کرکے وہاں کے چند مسلمانوں کو قتل کر دیا، یہ خلیفہ متوکل کا زمانہ تھا، جب اسکو عہد کے توڑنے کی اطلاع ہوئی، تو اس نے ارکانِ دولت سے مشورہ لیا، لیکن راستہ کی مشکلات کی وجہ کوئی فوج نہ بھیج سکا، اس سے بجہ والوں کی ہمت اور بڑھ گئی، اور ان میں سرکشی یہانتک بڑھی کہ صعید مصر کے باشندے ان سے خوف کھانے لگے،

یہ دیکھکر متوکل نے محمد بن عبد اللہ القمی کو اسوان کا والی بنا کر بھیجا، اور اقفط اسنا اور ارمنت کے مواضع اسکی ماتحتی میں دیے، اور اسے حکم دیا کہ بجہ کے ساتھ جنگ کرے، اور عامل مصر عنبسہ بن اسحاق کو لکھا، کہ لشکر وغیرہ سے اس کی مدد کرے، چنانچہ محمد بن عبد اللہ القمی نے تیس ہزار سوار اور پیادوں کے ساتھ بجہ کی طرف کوچ کیا، اور سات کشتیاں جو آٹا، زیتون، کھجور اور جو سے بھری ہوئی تھیں، بحر قلزم کے ذریعہ مملکت بجہ کے ساحل پر روانہ کیں، اور ان کو ہدایت کر دی، کہ وہ سمندر سے ہوکر لشکر سے آملیں، اس لڑائی میں مسلمانوں نے بڑی ثابت قدمی دکھائی، اور انھوں نے بجہ والوں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کیا، یہاں تک کہ اون کے سردار علی بابا نے امان طلب کی،

۲۴۱ھ میں یہ معرکہ پیش آیا تھا، اس کے بعد سے مملکت بجہ میں ہمیشہ کے لئے سکون ہوگیا، اور مسلمانوں نے ہر طرف پھیل کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، یہانتک کہ نوبہ و بجہ کی دونوں مملکتیں خالص اسلامی بن گئیں، اور مشرقی جہت میں سواکن سے لیکر مصوع تک اور نیل ابیض کا پورا علاقہ قریب قریب باسلام ہوگیا،

اس طرح سے پورا وہ علاقہ جو مشرق و مغرب میں سواحل بحر احمر اور نیل ابیض کے

درمیان اور شمال وجنوب میں پہلی آبشار اور فازوغلی کی پہاڑیوں کے درمیان پھیلا ہوا تھا، نورِ اسلام سے منور ہوگیا،

اس پر میں اتنا زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ شمالی افریقہ کے بربری مسلمانوں کے ساتھ عرب بھی دار الفور پہنچے، اور انھوں نے وہاں کے لوگوں کو مذہب اسلام کی تعلیم دینی شروع کی جس کی وجہ سے ایک دوسرا اسلامی ٹکڑا نکل آیا، جو پہلے اسلامی ٹکڑے سے کردفان میں مل جاتا ہے، اسکی وجہ سے وادی نطرون سے لیکر بحر الغزال تک کا پورا ٹکڑا بھی اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا، آج پورے سوڈان میں کوئی علاقہ ایسا باقی نہیں ہے، جہاں اسلام پھیل نہ گیا ہو، یہانتک کہ بحر الغزال اعالی نیل یعنی فاشودہ (یہ دونوں گذشتہ سال ایک دوسرے میں ملا دئے گئے، جس کی وجہ سے ایک ہی کمشنری ہوگئی، جو آج کمشنری استوائیہ کے نام سے مشہور ہے) اور کردفان کے بعض حصے جو آجتک بت پرستی میں مبتلا تھے، ان میں بھی مسلمان تاجروں کی کوشش سے اسلام پھیل گیا ہے، حالانکہ یہ کام علماء اسلام کی طرف سے ہونا چاہئے تھا، جن پر ان عیسائیوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی اشاعت واجب تھی، جو تعلیم اور شفاخانوں کے نشر و اشاعت سے دین مسیحی کو ہر جگہ پھیلا رہے ہیں، سوڈانی مسلمان سپاہیوں نے بھی جو اپنی مدتِ ملازمت ختم کرکے وطن واپس ہوئے تھے، اسلام کی اشاعت میں تاجروں کی بہت کچھ مدد کی ہے،

یہانتک کہ صرف اس کا بیان تھا کہ اسلام سوڈان میں کیونکر داخل ہوا، لیکن وہاں کی اجتماعی زندگی پر اس کا اثر تو اس نے وہاں بھی اپنا اتنا ہی اچھا اثر ڈالا جتنا کہ اس نے دوسرے ملکوں پر کیا تھا، کیونکہ اسلام عدل، صدق، اخلاص، مساوات اور ایک مجموعی عبارت میں فطرت اور ذوقِ سلیم کا دین ہے، پس اجتماعی زندگی کی پاکیزگی اور قربانی و ایثار کرنے میں غالبًا سوڈانی دوسری قوموں سے زیادہ فطرت کے قریب ہیں، ایک سوڈانی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے محبت کرنے والا اور مخلص مددگار

ہوتا ہے، وہ اپنے معاملات اور لین دین میں سچا اور اچھی نیت والا ہوتا ہے،

دنیا کی دوسری قوموں سے سوڈان کی علحدگی نے اسکو اب تک تمام برائیوں سے بچائے رکھا، اب جب کہ دوسری قومون کیساتھ ربط وضبط اور مواصلات میں آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں، میں نہیں جانتا کہ آیندہ اس کا کیا حل ہوگا، سوڈانی مسلمانوں کا تمدن بھی عجیب وغریب ہے، شروع ہی سے سوڈانی مسلمان ایک ہی طرح پر زندگی بسر کرتا ہے، اور ایک ہی طرح فکر کرتا ہے، معلوم نہیں، کہ اس کے بعد انکی اسلامی حالت کیا ہوگی،

میں چاہتا تھا کہ سوڈان کی مذہبی زندگی پر پوری طرح بحث کرون، کیونکہ مجھے نظر آتا ہے، کہ اس میں ایسے قوی اسباب موجود ہیں، جو سوڈانیون کو تنظیم پر برانگیختہ کرسکتے ہیں، سوڈانی قوم ایک چٹان ہے، جس پر تنظیم کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، میں اس جگہ کے اجتماعِ نقیضین پر تعجب کرتا ہون، لیکن تعجب کیوں ہو، اگر ہم کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی روشنی میں سوڈانیوں کی زندگی پر غور کرینگے تو معلوم ہوگا، کہ ان کی زندگی بالکل مذہبی ہے، اور مذہبی استقلال ان میں اب تک موجود ہے، اس کے آثار مصر میں بھی پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی ہدایت وعرفان کے پھیلنے کی جگہ ہے، اسلیئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں، کہ سوڈان نے اسلام کی دولت سے بہت اچھا حصہ پایا ہے،

عربوں کی جہازرانی

مسلمانون نے فنِ جہازرانی میں جسقدر ترقیاں کیں جسقدر جہاز بنائے، جہازون کے بنانے کے لئے جسقدر کارخانے قائم کئے، جسقدر بندرگاہیں قائم کیں، ان سب کے متعلق تاریخی معلومات اسلامی تاریخوں میں نہایت منتشر و پراگندہ ہیں، مولینا سید سلیمان ندوی نے ان پراگندہ معلومات کو اس رسالہ میں یکجا کیا ہے، ضخامت ۱۹۶ صفحے،

قیمت: ۔ عہ

"منیجر"

عبّاسی دربار کے اثرات

عربی ادب و ثقافت پر،

از جناب عبدالقیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی۔

بنی امیہ کے زوال کے بعد تاریخِ اسلام مین ایک نئے دور کا آغاز ہوا، نئی ثقافت کی بنیاد رکھی گئی، نئے تمدن ومعاشرت کو جو عربی تمدن سے مختلف تھا، قبول کیا گیا، اور نئے نئے خیالات نے عقائد و ادب میں جگہ حاصل کی، نئے علوم اور نئے عہدے عباسیوں کے دربار میں جنم لے کر پروان چڑھے،

بعض لوگ تعصّب یا محدود مطالعہ کی وجہ سے بنو امیّہ کو اس بنا پر برا کہتے ہیں، کہ انھون نے کوئی ٹھوس علمی خدمت انجام نہیں دی، اور ان پر تنگ خیالی کا الزام عائد کرتے ہیں، کہ حریتِ فکر کا کوئی نتیجہ ان کے عہد میں بروے کار نہیں آیا، یہ لوگ دونوں کے زمانۂ حکومت کے فرق کو نظرانداز کرجاتے ہیں، اگر بنی امیہ کو بھی اتنی طویل حکومت کا موقع ملا ہوتا، تو وہ یقیناً بنو عباس سے کہیں زیادہ خادم دین وعلم ثابت ہوتے، بنو امیہ کی علم پروری اور حریتِ فکر کے نتائج دیکھنے کے لئے اندلس کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے، کہ کس سرعت اور برق رفتاری کے ساتھ میدانِ علم وعقل میں وہ سب سے آگے بڑھگئے،

چند خصائص یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کے خاص خاص امتیازات ہوتے ہیں، جو انھیں رنگ، نسل، لسانی اور جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ فکر و تدبر، طرز بود و ماند، عقل و دانش اور علم وعمل میں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں، اور یہ چیزیں اقوام کے ملکی و طبعی حالات و تاریخی روایات

حکمران افراد کی ذہنیت و سلوک، مصلحین اور قائدین کے طرزِ عمل، اور سیاسی اور معاشرتی نظام سے اثر پذیر ہوتی ہیں،

جب مختلف قومیں ایک حکمران کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں، تو مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر ایک شاندار تمدنی نتیجہ پیدا ہونا لازمی امر ہے، عباسیوں کی سلطنت سندھ سے لیکر تونس، مراکش اور الجزائر تک کے وسیع رقبہ پر محیط تھی، جس میں مختلف قومیں آباد تھیں، جنکے خصائص جدا جدا تھے، انکے یہ تمام خصائص عباسی معاشرت، سیاست، عقائد، علوم و آداب پر بہت حد تک اثر انداز ہوئے،

پھر ان مختلف اقوام کے ازدواج، اختلاط اور امتزاج سے ایک ایسی نسل پیدا ہوئی، جو قومیت اور خون کے اعتبار سے مختلف قوموں کے اوصاف کی حامل تھی،

اس سلسلے میں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا، کہ حرم میں آزاد اور شریف النسل عورتوں کیساتھ ساتھ لونڈیوں کا رواج بھی تھا، اس رواج کو اس لئے زیادہ مقبولیت ہوئی، کہ شریف عورتوں کے مقابلہ میں لونڈیوں کا رکھنا بہت زیادہ آسان تھا،

اس اختلاط کا اثر محض نسلی امتزاج تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ شعر و سخن، علم و ادب، اور سیاست و معاشرت وغیرہ کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا، عربی شاعروں نے فارسی تغزل کا رنگ اڑایا، جاہلی شاعری میں شراب اور محبوبہ کا ذکر ہے، مگر عباسیوں کے عہد میں فارسی اثر نے ان میں جوابِ رنگ پیدا کر دیا، وہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں مفقود نظر آتا ہے، اسی طرح فارسی شعراء نے عربی اسلوب اور قافیہ کو اپنا لیا، نثر میں حکماے یونان اور فارس کے مقولے بکثرت جمع ہو گئے،

مذہبی عقائد بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے، یہودیوں، عیسائیوں، زردشتیوں، اور مجوسیوں وغیرہ کے اجتماع و اختلاط نے عقائد میں جدتیں پیدا کیں، علماے اسلام نے ان کی روک کے لئے علم کلام پیدا کیا، اور استدلال کو نئے سانچے میں ڈھالا، اور مناظروں اور مباحثوں نے نیا رنگ اختیار کیا،

فارسی ثقافت

عباسی تہذیب میں بہت سی ثقافتیں کارفرما تھیں، ان میں ایرانی، یونانی اور ہندی قابلِ ذکر ہیں، ان مختلف اقوام کے جذبات و خیالات، مختلف علمی استعدادوں اور قابلیتوں، مختلف زبانوں اور ان کے محاورات نے عربی ادب اور ثقافت میں نمایاں انقلابات پیدا کئے، فارسی ثقافت خصوصیت کے ساتھ سب ثقافتوں سے زیادہ اثر انداز ہوئی، یہانتک کہ اموی عہد کو عربی حکومت سے اور عباسی عہد کو فارسی حکومت سے تعبیر کیا جانے لگا،

وزارت

فارسی تہذیب و ثقافت پر پہلا اثر یہ ہوا کہ عباسی دربار میں ایک نئے عہدے کی بنیاد رکھی گئی، اس سے پہلے عربی تہذیب و تمدن اس عہدے سے بالکل ناآشنا تھا، عرب اس لفظ سے واقف تو تھے، اور اس کو اپنے کلام میں استعمال بھی کرتے تھے، مگر ان خاص معنوں میں یہ چیز عربوں کے ہاں مفقود تھی، عباسیوں کے عہد میں یہ لفظ اپنے خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا، اور عہدۂ وزارت اپنے خاص فرائض و حقوق کیساتھ معرضِ وجود میں آیا،

اس عہدے کے متعلق یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکثر وزرا عجمی منتخب ہوئے، وزیروں کے مختلف فرائض اور ذمہ داریاں تھیں، بعد میں ہر شعبہ کے لئے علحدہ علحدہ وزیر مقرر ہونے لگے،

وزیر کے لئے ضروری تھا، کہ وہ بہترین ادیب ہو، نظم و نسق کی قابلیت رکھتا ہو، فہم رسا کیساتھ وسیع معلومات رکھتا ہو، اسکے علاوہ وزیر کو ایک کاتب یعنی سکریٹری بھی ملتا تھا، اس سے کاتبوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی، جو بڑے صاحبِ قلم ثابت ہوئے، کاتب بھی اکثر و بیشتر عجمیوں ہی سے پیدا ہوئے،

اس جماعت نے علم و ادب پر بھی تسلط جما لیا، اور اپنے درسی علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا،

یہاں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ اس دور میں بہت سی کتابیں کاتبوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے لکھی گئیں، جو "ادب الکاتب" اور "ادب الکتاب" کے ناموں سے مشہور ہوئیں، علما، کے اس گروہ نے فارسی علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کیا، فارسی حکما، کے اقوال، فارسی ادب کی کتابیں وغیرہ، ہر دلچسپ ادب کو عربی میں منتقل کرنے کی کوشش کی،

بغداد کے دار الخلافہ بنتے ہی وہ فارسی تہذیب و تمدن کا مرکز قرار پاگیا، خلفائے عباسیہ نے عجمی خواتین کو اپنے حرم میں لیا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عباسیوں کے رجحانات فارسیوں کی طرف مائل ہوگئے،

اس عہد میں بہت سے فارسی الفاظ عربی میں مستعمل ہونے لگے، عجمیوں نے عربوں کو نزاکت خیال بخشی،

ایرانی قدیم زمانہ سے شراب و کباب اور نغمہ و سرود کی جانب بہت مائل تھے، بلکہ یہ چیزیں ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں، اسلئے اونھوں نے ان چیزوں کو عربی اشعار و کلام میں پیش کیا، شعرائے جاہلیت کے کلام میں بھی شراب و عشق کا ذکر ہے، مگر طرفہ اور امرؤ القیس، اور ابو نواس، صریع الغوانی، اور بشار کی لطافت بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے،

اسی طرح عباسیوں کے قبل کے عربی شعرا نے بھی زہد و تقشف اور زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے، اگرچہ جو شے ابو العتاہیہ نے پیش کی وہ کچھ اور ہی حیثیت رکھتی ہے،

عربی ادب میں بھی حیوانات اور حشرات کی زبانی حکایات و اقوال موجود تھے، مگر اس دور میں تراجم کی وجہ سے بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، ان میں کلیلہ و دمنہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے،

عربی ادب پر فارسی اثر کا ذکر علامہ ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، کہ اسلامی علوم کے حامل قطع نظر اس سے کہ وہ علوم شرعی ہوں یا عقلی، اکثر و بیشتر عجمی ہیں، اگر بعض نسبت کے لحاظ سے عربی ہیں تو زبان تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی،

ہندوستانی ثقافت، ہندوستانیوں اور عربوں کے تعلقات ظہور اسلام کے بہت پہلے سے چلے آتے ہیں، اسلام کے سرزمین ہند پر قدم رکھنے سے بہت پہلے عربوں اور ہندوستانیوں میں تجارتی تعلقات قائم تھے، چنانچہ عربی لٹریچر میں "ہند" کا لفظ مختلف صورتوں اور شکلوں میں ملتا ہے،

جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اور مسلمانوں نے اسلام کا جھنڈا سرزمین فارس پر لہرایا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہندوستان کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنے کے لئے امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے ایک تحقیقاتی وفد ہندوستان بھیجا، یہاں اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کے پیش نظر یہ پہلا اسلامی وفد جو علمی تحقیقات کے لئے ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا، اپنی تحقیقات کو سندھ کے علاقہ، مکران تک محدود رکھنے پر مجبور ہوا، بہت ممکن ہے کہ وسائل آمد و رفت کی تکالیف کے ساتھ اس وقت کی ملکی و سیاسی مصلحتیں اور ہندوستانی حکام کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں بھی اس وفد کے آگے بڑھنے سے مانع ہوئی ہوں، بہرحال اس وفد نے اپنی تحقیقات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خلیفہ کے سامنے پیش کیا،

"ملک میں پانی کی قلت ہے، پھلوں میں ردی قسم کی کھجور پیدا ہوتی ہے، چور اور ڈاکو بڑے دلیر ہیں، راہزنوں کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک قلیل جماعت اس ملک میں داخل ہو تو ڈاکو انھیں لوٹ لیں، اور پیداوار کی قلت کا یہ حال ہے، کہ اگر مسافر کثیر تعداد میں کارواں در کارواں اس ملک میں داخل ہوں" تو بھوکوں مرجائیں"

اس کے بعد بنو امیہ کے عہدِ حکومت میں حجاج کے حکم سے جواں سال محمد بن قاسم ثقفی نے ساحل کراچی کے بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے روکنے کے لئے ہندوستان پر لشکر کشی کی، اور ملتان تک فاتحانہ چلا آیا،

یہ واقعات ہندوستان اور عرب کے درمیان بہت سے خوش آیند نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، عباسیوں کے عہد میں اسلامی مقبوضات کابل و کشمیر تک پھیل گئے،

ان فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوگیا خصوصا سندھ اور اس کے قرب وجوار میں اسلامی دعوت کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی،

قبولِ اسلام کے ساتھ یہ لوگ علم دوست بھی بن گئے، اور علمی خدمت کے سلسلہ میں اپنی ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑ گئے، جو اب تک کتابوں میں موجود ہیں،

عربی علم وادب کی تاریخ کا طالب علم ابوعطا سندھی کے اشعار سے بے خبر نہیں ہوسکتا، علم لغت میں سندھی علماء نے کافی شہرت حاصل کی، عربی لغت ابن الاعرابی کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، شاید یہ سنکر تعجب ہوگا، کہ عربی لغت کا یہ مایہ ناز عالم بھی ایک سندھی غلام ابوزید کا لخت جگر تھا، اسی طرح علم حدیث میں بھی سندھیوں کے کارہائے نمایاں نظر آتے ہیں، حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں بہت سے سندھی محدثین کے حالات قلمبند کئے ہیں،

ہندوستانی عہد قدیم سے دنیا کی مشہور اور مہذب اقوام میں شمار کئے جاتے تھے، اور انکی تہذیب کو چین، روم، فارس، اور یونانی تہذیب کے برابر درجہ حاصل تھا، صنعت و حرفت علم و فن خصوصا طب نجوم اور ریاضیات میں ہندوستان کی بڑی شہرت تھی، ہندی فلسفے اور الہیات کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، علوم وفنون کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کھیل بھی بہت مشہور تھے، فلسفیانہ اور حکیمانہ اقوال ہندوستانی ادب میں بکثرت پائے جاتے ہیں،

یہاں بتا دینا ضروری ہے کہ ہندوستانی فلسفۂ الہیات کا تعلق صرف نظریات اور عقلیات تک محدود تھا، عملیات اور محسوسات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا،

ہندوستانیوں کے عقائد میں جو شئے مسلمانوں کے لئے تعجب کا باعث ہوئی، وہ عقیدۂ تناسخ تھا،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علم دوستی، بلکہ علم پروری کا ثبوت دیا، کسی قوم کے علم کی تحصیل میں کبھی کوئی عار نہیں کیا، جس قوم اور جس ملک سے جو چیز اچھی ملی، اسے صرف قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اسکو ترقی کے آخری زینے تک پہنچا دیا،

ریاضی انھوں نے ہندوستانیوں سے حاصل کی، پھر اس میں اتنا کمال پیدا کیا، کہ خود دنیا کے استاد کہلائے، عباسی عہد میں متعدد کتابیں ہندی سے عربی میں منتقل کی گئیں،

عباسیوں نے ہندوستانی حکما، اور اطبار کو اپنے دربار میں عزت واحترام کی جگہ دی اور انعام واکرام سے نوازا،

عباسیوں کے عہد میں ذوقِ علم بہت ترقی کر چکا تھا، تمام مشہور اور مفید کتابیں عربی میں منتقل ہورہی تھیں، ہندی ادب کی بہترین کتابیں جو فارسی میں ترجمہ ہوچکی تھیں، عباسیوں کے عہد میں فارسی سے عربی میں منتقل کی گئیں،

ان اثرات کے علاوہ باہمی اختلاط اور میل جول سے عربی زبان میں بھی اضافہ ہوا بہت سے ہندی الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے لگے، بالخصوص دواؤں، درختوں، پھولوں اور جانوروں کے نام،

ہندوستانی خیالات بھی عربی ادب پر اثر انداز ہوئے، ہندی کی قصہ اور کہانیوں کی کتابوں کے عربی میں منتقل ہونے سے ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا،

اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ شطرنج بھی عباسی دربار میں ہندوستانی ثقافت

کی یادگار تھی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ کھیل عربوں نے فارسیوں سے سیکھا یا براہ راست ہندوستانیوں سے، مگر اس میں کلام نہیں، کہ یہ کھیل ہندوستانی دماغ کی پیداوار ہے،

یونانی ثقافت یونان قدیم زمانہ سے ایک متمدن ملک تھا، اور اسے بجا طور پر اپنے علوم و فنون اور ثقافت پر ناز رہا، یونان علم و دانش اور عقل و فکر کے میدان میں تمام ممالک و اقوام سے سبقت لے گیا، یونانیون نے طب، فلسفہ و حکمت، ادب، تاریخ، ریاضیات، سیاسیات اور فنون لطیفہ وغیرہ کا دنیا کو ایک مدت تک سبق دیا،

یونانی ثقافت کے تین بڑے مرکز عربی ثقافت و ادب پر زیادہ اثر انداز ہوئے، اسلئے ان اسکولوں یا مرکزوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے،

جُندیسابور جندیسابور طب یونانی کا بہت بڑا مرکز تھا، اسلام سے پہلے اور بعد دونوں زمانوں میں اس نے بڑے بڑے مشاہیر اطبا پیدا کئے، یہانتک کہا جاتا ہے، کہ عرب جاہلی کا مشہور طبیب حارث ابن کلدہ ثقفی بھی اسی اسکول کا سند یافتہ تھا، اور اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہین کہ عباسی دربار کے اکثر و بیشتر اطبا اسی اسکول کے تعلیم یافتہ تھے،

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک بہت بڑا ہسپتال بھی اس اسکول سے ملحق تھا، جہان عملی تعلیم دیجاتی تھی اسکے معلمین اور شیوخ میں ہندوستانی اہلِ فن بھی نظر آتے ہیں،

حرّان ریاضیات اور بالخصوص علم ہیئت کا مرکز تھا،

اسکندریہ ادب اور فلسفہ کا مرکز تھا، یونانی فلسفہ کی نشر و اشاعت میں جسقدر اسکندریہ کو دخل ہے کسی اور اسکول یا مرکز کو نہیں، بہت سی کتب فلسفہ عربی زبان میں منتقل کی گئیں،[1]

[1] اس اسکول کا اثر اموی عہد میں بھی نظر آتا ہے، خالد بن یزید بن معاویہ کے حکم سے چند ایک کتابیں عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے عہدِ خلافت میں بھی اسکندری طبیب ابن ابجر کا پتہ چلتا ہے،

عباسی عہد میں مترجمین کی ایک بہت بڑی جماعت نظر آتی ہے جو مختلف علوم کی کتابین عربی میں ترجمہ کرتی تھی، فلسفہ، منطق، طب، ہیئت، معاشرت و تمدن غرض ہر علم کی کتابون کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا،

تراجم کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ مسلمانوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا، یونانی ثقافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی، مسلمان یونانیوں کے علوم، عقائد اور خیالات سے آگاہ ہوئے، یونانیوں کے طرزِ بیان، اسلوبِ تکلم اور طریقِ استدلال سے واقفیت حاصل ہوئی،

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان علوم کو عربی میں منتقل کر کے زمانے کے دستبرد سے محفوظ کر دیا، اپنے علم کلام کو زیادہ مضبوط کیا، یونانی حکماء و فلاسفہ کے طرز و اسلوب کو بقدرِ ضرورت اپنا لیا،

یونانی ثقافت اسلامی فلسفہ اور تصوف پر بھی اثر انداز ہوئی، مگر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ یونانی علوم ہمیشہ ثانوی حیثیت رکھتے تھے، مسلمانون نے ان علوم کو اپنی کتابون میں صرف اسی قدر جگہ دی، جسقدر کہ ان کی افادیت کا تعلق تھا، غیر ضروری اور لاطائل مباحث کو نظر انداز کر دیا، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یونانی حکما کے اکثر نظریات کی تردید کی، اور اس پر مستقل کتابین لکھین،

تلخیص و تبصرہ

کائنات بغیر خدا کے

مندرجۂ بالا عنوان سے ڈاکٹر سنڈر لینڈ (Dr. J. T. Sunderland) کا ایک مقالہ ہفتہ وار ٹروتھ، لاہور، (۷ / نومبر ۳۶ء) میں نقل ہوا ہے، ناظرین معارف کے لئے اس کا خلاصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے، الحاد کی بے مائگی پر مغرب کے ایک فاضل کے یہ خیالات ہمارے ملک کے "روشن خیالوں" کے لئے قابل عبرت ہیں، :-

الحاد کے اثرات برے ہوتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ تمام ملحدین برے لوگ ہیں، برعکس اس کے ہر سمجھدار اور انصاف پسند آدمی تسلیم کرے گا، کہ ملحدین میں بہتیرے بلند اخلاق کے بھی ہیں، جو تقریباً ہر نیک مقصد کی ترقی میں خلوص کیساتھ کوشاں رہتے ہیں، مثلاً اب سے دو صدی پہلے غلامی کے انسداد کے لئے جو تحریک اٹھائی گئی تھی، اس میں ممتاز ملحدین بھی شریک تھے، ایسے ہی بعد کی تحریکوں میں بھی جو عورتوں کی ترقی، قید خانوں کی اصلاح، اور جنگ کے انسداد کے لئے شروع کی گئیں، ملحدین کی شرکت نمایاں رہی،

لیکن ان تحریکوں میں اکثریت ملحدین کی نہ تھی، بلکہ ہمیشہ ان لوگوں کی تھی، جو خدا کے قائل تھے، اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں، کہ جن ملحدوں نے ان نیک تحریکوں میں حصہ لیا، انھوں نے ہمیشہ یا عموماً اپنے الحاد کی وجہ سے ایسا کیا، جو لوگ خدا کے قائل ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ خدا کا

انکار خواہ وہ کسی شکل میں ہو بہت سی حیثیتوں سے برا ہے، ان میں سے زیادہ اہم حیثیتیں حسب ذیل ہیں،

الحاد کائنات کو بیحد پست کر دیتا ہے، ٹامس ہکسلے، (Thomas Huxley) نے جو ڈارون (Darwin) کا ممتاز ہم عصر تھا، مادہ پرست (ملحد) کی کائنات کی تعریف یوں کی ہے، :-

"دو نابینا بچوں یعنی مادہ اور قوت کا بنایا ہوا ایک مٹی کا سنبوسہ" یہ طنز ضرور ہے، لیکن کسی شخص نے اس سے زیادہ صداقت کے ساتھ مادہ پرست کی دنیا کی تعریف نہیں کی ہے، کوئی شبہہ نہیں کہ جو کائنات عقل یا مقصد سے خالی ہوگی، وہ ایک نہایت درجہ پست اور حقیر چیز ہوگی، ایسی کائنات میں نہ کوئی قانون ہوگا، نہ ترتیب کیونکہ یہ چیزیں صرف عقل سے پیدا ہوتی ہیں، اس میں نہ زندگی کو پیدا کرنے کی قوت ہوگی، اور نہ اس کے اندر زندگی قائم رہ سکیگی،

الحاد انسان کو بھی انتہائی پستی اور ذلت تک پہنچا دیتا ہے، جو انسان خدا کا قائل ہے، اس کے مرتبہ اور قدر کی انتہا نہیں، وہ ایک غیر محدود مقصد کا نتیجہ ہے، وہ کائنات کے وسیع ارتقائی نظام کی بلند ترین کڑی ہے، بقول قدیم عبرانی شاعر کے "وہ خدا سے کچھ ہی نیچے ہے" برخلاف اسکے ملحد کی حیثیت کسقدر مختلف ہے! اس کا وجود محض اتفاق کی بنا پر ہے، اس کی ذات کسی مقصد کی نمائندگی نہیں کرتی، اسکی ہستی کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ بیجان مادہ اور اندھی قوت کی پیداوار ہے،

اگر دنیا کے سائنسدان بالآخر اس بات کے قائل ہو جائیں کہ کائنات عقل اور مقصد کی کارفرمائی سے خالی ہے، یعنی اس کی ہر چیز اتفاقی اور بغیر مدعا کے ہے، تو اس کا اثر ان پر کیا پڑے گا، ؟ کیا اس عقیدہ کا اثر حد درجہ تباہ کن ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، ؟ کیا سمجھدار لوگ زیادہ دنوں تک اُن چیزوں کی تفتیش و تحقیق میں مصروف رہیں گے، جن کے متعلق وہ یقین کر چکے ہیں، کہ اتفاق اور انتشار محض سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں، ؟

تمام پیغمبروں نے خدا اور انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے، جو لوگ خدا کے قائل ہیں،

ان کا عقیدہ ہے کہ تمام بہترین مذاہب کی تعلیم یہی ہے، لیکن کیا ملحدین بھی خدا اور نوعِ انسانی کی محبت کے قائل ہیں، ملحدین میں جو بہترین دل و دماغ کے لوگ ہیں، وہ بھی اس تعلیم کے نصف سے زیادہ نہ بڑھ سکے۔ ان کی نظر فطرتِ انسانی کے صرف ناسوتی پہلو تک پہنچ کر رک گئی؛ وہ اس کے ملکوتی پہلو سے یا تو انکار کرتے ہیں، یا اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے،

اگر دنیا کا بڑا حصہ کبھی یہ عقیدہ رکھنے لگے، کہ انسان ایک روحانی اور ربانی فطرت کے حامل ہونے کے بجائے جس کا تعلق خالقِ کائنات سے ہے، محض ایک اتفاقی چیز ہے، اور صرف ایک ایسا حیوان ہے، جو غیر معمولی طور پر ذہین واقع ہوا ہے، تو اس عقیدہ کے نتائج کیا ہوں گے،؟ کیا نوعِ انسانی کا اپنی قدر و قیمت سے متعلق اس درجہ پست اور حقیر اندازہ نہایت اہم نتائج سے خالی رہ سکتا ہے،؟ کیا اس عقیدہ سے تمام انسانی ترقی، عمرانی، تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی حقیقۃً رک نہ جائیگی؟ کیا لوگ ترقی اور تمام بلند چیزوں میں دلچسپی لینا موقوف نہ کر دیں گے،؟ کیا لوگوں کی سیرت سے سرگرمی اور اخلاق کا عنصر زائل نہ ہوتا جائے گا، اور وہ روز بروز اس خیال کے پیرو نہ ہوتے جائیں گے، کہ ہمیں کھا پی کر زندگی گذار دینی چاہئے، کیونکہ کل مرہی جانا ہے؟

جو لوگ وجودِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کا اعتقاد دنیا کے لئے بہترین بشارت ہے، یہ ایک حقیقی بشارت ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کے نزدیک سب سے زیادہ قدر و قیمت کی ہو سکتی ہیں، ان سب کے تئیں ایجابی حیثیت رکھتی ہے، مثلاً (۱) خدا کا اعتقاد ایک ایسا مذہب ہے جس کے بنیادی عنصر دو ہیں، خدا سے محبت اور نوعِ انسانی سے محبت، بہ الفاظِ دیگر یہ ربوبیتِ الٰہی اور اخوتِ انسانی کا مذہب ہے، (۲) یہ ایک ایسا مذہب ہے جس کا مقصد ایک عالمگیر تحریک میں دنیا کے تمام نیک آدمیوں کو اس غرض سے شریک کر دینا ہے، کہ دنیا اور نسلِ انسانی کی اصلاح و ترقی کا ربانی نظام روز بروز زیادہ قوت کے ساتھ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا جائے،

اس کے بالکل برعکس الحاد کی حالت ہے، جو اپنے اندر کوئی بشارت نہیں رکھتا، بلکہ وہ تمام تر نفی و انکار پر مبنی ہے، یہ صحیح ہے، کہ اس میں اکثر اہم ایجابی پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ باہر سے لا کر شامل کئے گئے ہیں، الحاد کے اندر خود کوئی ایجابی پہلو نہیں ہے، اس کی تمام فطرت ہی انکار سے بنی ہے، الحاد کے بنیادی انکار چھ ہیں:- (۱) خدا کے وجود سے انکار، (۲) روحِ انسانی کے وجود سے انکار (۳) حیاتِ ابدی سے انکار، (۴) کائنات میں کسی ایسی عقل کے وجود سے انکار جو انسان کی عقل سے زیادہ بلند ہو، (۵) کائنات میں کسی مقصد کے وجود سے انکار (۶) روحانی دنیا کی حقیقت سے انکار،

جیسا کہ پہلے تسلیم کیا جا چکا ہے، الحاد کا ایک پہلو قابلِ ستائش ہے، یعنی بہترین خارجی چیزوں سے اس کا تعلق، مثلاً اہم اجتماعی اصلاحات، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، لیکن بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آیا الحاد کے انکار کی وجہ سے ان اصلاحات پر تو کوئی مضر اثر نہیں پڑتا،

الحاد کی ایک سطحی قسم بھی ہے جسے اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں، وہ وجودِ خداوندی کو ایک قدیم اور فرسودہ وہم پرستی سے تعبیر کر کے اُسے ترک کر دینے پر فخر کرتا ہے، لیکن ملحدین میں جو لوگ اہلِ عقل اور صاحبِ فکر ہیں، انھیں خوب معلوم ہے کہ انکا الحاد دنیا کے تلخ تجربات کا مقابلہ کرنے کے لئے کس قدر کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے،

ہر شخص جانتا ہے کہ سمندر میں کسی بڑے جہاز پر سفر کرنا اس حال میں کہ جہاز اپنی پوری رفتار کیساتھ جا رہا ہو، اور اس پر کوئی قائد یا کپتان نہ ہو، کس درجہ خطرناک ہے، لیکن کیا اس کرۂ ارض کے جہاز پر جو غیر معلوم فضا میں سمندر کے جہازوں سے ہزارہا ہزار گنا زیادہ سرعت کیساتھ جا رہا ہے، سفر کرنا کچھ کم خطرناک ہوگا، اگر ہمکو معلوم ہو جائے کہ اس جہاز پر نہ کوئی کپتان ہے، نہ قائد، اور نہ کوئی ایسی عقل جو ہماری راستہ اور انجام کی رہنمائی کر رہی ہو، ٹھیک یہی حالت تمام نسلِ انسانی کی ہوگی اگر خدا کے وجود سے انکار کر دیا جائے،

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں پروفیسر کنگ فورڈ کلیفرڈ (King ford cliffor d)

اور پروفیسر جارج رومانیز (George Romanes) انگلستان کے ممتاز ترین سائنسدانون میں تھے، یہ دونوں مادیت کے قوی اثرات سے جو مسئلۂ ارتقا کی اشاعت کے بعد کچھ دنوں تک پھیلے ہوئے تھے، خدا کے منکر ہوگئے، لیکن دونوں کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہی کہ کبھی کبھی وہ ایمان کے فقدان میں الحاد کی غمگینی بری طرح محسوس کرتے تھے، پروفیسر کلیفرڈ کے ایک مقالہ کا مندرجۂ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔" اس میں شبہہ نہیں کہ جو لوگ وجود باری تعالی کے قائل ہیں، ان کے لئے یہ عقیدہ تسکین وتسلی کا باعث ہی، اور اس سے محروم ہوجانا نہایت ہی تکلیف دہ ہے، اس میں کم از کم ہمارے زمانہ کے اُن بہت سے آدمیون کو شبہہ نہیں ہوسکتا، جو یا تو اسوقت بھی اس عقیدہ کے قائل ہیں، یا بچپن میں اسے حاصل کرنیکے بعد ایسے رنج وتکلیف کیساتھ اُسے چھوڑ چکے ہیں، جو صرف پیدائشی مذہب کے ترک کرنیسے محسوس ہوسکتی ہی، ہم نے موسم بہار کے آفتاب کو ایک خالی آسمان پر طلوع ہوکر ایک بے روح دنیا کو روشن کرتے ہوئے دیکھا ہی، پھر ہم نے انتہائی تنہائی کی حالت میں یہ بھی محسوس کیا ہی کہ وہ رفیق اعلی ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا"؛

اس سے زیادہ غمناک پروفیسر رومانیز کے وہ الفاظ ہیں، جو انھون نے اپنی مشہور کتاب فزیکس ([illegible]) کے آخر میں لکھے ہیں، یہ کتاب الحاد کی مدافعت میں ایک نہایت زبردست تصنیف خیال کی جاتی ہی، وہ لکھتے ہین:۔ مجھے اس امر کا اقرار کرنے میں شرم نہیں کہ عملی طور پر یون خدا کا انکار کردینے سے کائنات کے حسن وخوبی کی روح جاتی رہی، اور اگرچہ اب سے اس تعلیم کی قوت کہ "جبتک دن ہے کام کرلینا چاہئے" بلاشبہہ ان الفاظ کے حد درجہ شدید معنی کی وجہ سے کہ "رات آرہی ہی جب کہ کوئی شخص کام نہ کرسکے گا" اور زیادہ بڑھ جائیگی تاہم جب بعض اوقات میں بالکل لابدی طور پر غور کرتا ہون، کہ اُس مذہب (عقیدۂ خداوندی) کی مقدس عظمت جو کبھی میرا تھا، اور وجود کے وحشت انگیز راز کے درمیان جسے میں اب دیکھ رہا ہون کسقدر ہیبت ناک فرق ہے، تو میرے لئے ناممکن ہوجاتا ہی کہ شدید ترین تکلیف جسکی میری فطرت اہل ہی محسوس نہ کرون"؛

"ع۔ ز"

مدتِ حیات کی توسیع،

سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۵ ار نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک دلچسپ مضمون اس موضوع پر شائع ہوا ہے، جسکا خلاصہ درجِ ذیل ہے،:۔

یہ صحیح ہے، کہ غدود کے ذریعہ جسم میں از سر نو شباب کی لہر دوڑائی جاسکتی ہے، لیکن حیاتِ ابدی کا حصول اس صورت سے بھی ممکن نہیں، تجربہ ثابت کرچکا ہے کہ جو شباب غدود کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کا زوال بھی نہایت سریع ہوتا ہے، جدید ترین تحقیق یہ ہے، کہ مدتِ حیات کا تعلق غدود سے نہیں بلکہ دماغ سے ہے، معمولی قد کے انسانی دماغ میں چودہ ارب اکائیان (Neurons) ہوتی ہیں، اور وہ جسم کے تمام دوسرے خلیون (Cells) سے اس بات میں مختلف ہوتی ہین، کہ ضعیف ہوجانے کے بعد اپنے اندر پھر پہلی سی قوت پیدا نہیں کرسکتیں، ہماری ہڈیوں، پٹھوں، اور خون کی قوت برابر خرچ ہوتی رہتی ہے، اور پھر پیدا ہوتی رہتی ہی، لیکن دماغ کی قوت زائل ہونے کے بعد دوبارہ لوٹ نہیں سکتی، یہی وجہ ہے کہ غدود کی مدد سے جسم کا اعادۂ شباب تو ہوسکتا ہے، لیکن دماغ کی وہ قوت جو ایک حد تک پہنچ کر کم ہونے لگتی ہے پھر واپس نہیں ہوتی، چونکہ دماغ کی قوت از سر نو پیدا نہیں ہوتی، اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی عمر وہی ہوتی ہے، جو اس کے دماغ کی عمر ہے، اور جب دماغ اپنا سرمایہ ختم کرکے فنا ہوجاتا ہی، تو انسان کا مرجانا بھی ضروری ہوجاتا ہی،

انسانی دماغ وزن اور قوت میں عمر کے بیسوین سال سے چالیسوین سال تک بڑھتا رہتا ہے، عورت کا دماغ بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان پختہ ہوتا ہے، اور مرد کا تیس اور چالیس سال کے درمیان، اور یہ پختگی دس، بیس، اور کبھی کبھی تیس سال تک قائم رہتی ہے، علمائے سائنس

یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہین، کہ انسانی دماغ بہترین حالات میں زیادہ سے زیادہ کتنے دنون زندہ رہ سکتا ہے، کیونکہ یہی مدت انسانی زندگی کی بھی قرار دیجائے گی، چنانچہ جن لوگوں نے غیر معمولی طور پر طویل عمروں میں وفات پائی ہے، ان کے حالات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جاتا ہے، کہ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے رہے ہوں گے، جو اپنی فطری زندگی کے آخری لمحات تک زندہ رہ کر بغیر کسی مرض کے مرے ہون گے، پروفیسر پیکاک (PEACOCK) کی رائے ہے، کہ نہ صرف انسان بلکہ کسی حیوان کی عمر بھی ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں، لیکن دوسرے سائنسدانون کے نزدیک ڈھائی سو برس کا تخمینہ زیادہ صحیح ہے، اپنے خیال کی تائید میں انھون نے چند مثالیں بھی فراہم کی ہیں، کارڈوا (جنوبی امریکہ) میں لوئسا ٹرکزو (LOUISA TRUXO) نامی ایک عورت نے ۱۷۸۰ء میں انتقال کیا، اور اس وقت اس کی عمر (۱۷۵) بتائی گئی، شہر کی کونسل نے اس بیان پر یقین نہ کرکے سرکاری طور پر تفتیش و تحقیق شروع کی اور بالآخر اس نتیجہ پر پہونچی کہ متوفیہ کی عمر در اصل (۱۷۵) ہی سال تھی، ۱۷۲۴ء میں ہنگری کا ایک کسان جس کا نام زارٹن پٹراش (Zarton Petratsh) تھا، سرکاری دفتر کے اندراجات کے مطابق (۱۸۵) سال کی عمر میں مرا، پھر ایک انگریز ٹامس کارن (Thomas Carn) نے جو شاہ رچرڈ ثانی کے عہد (۱۳۷۷ء تا ۱۳۹۹ء) میں پیدا ہوا تھا، (۲۰۷) سال کی عمر پاکر ملکہ الزبتھ کے عہد (۱۵۵۸ء تا ۱۶۰۳ء) میں وفات پائی، ان سب سے بڑھ کر لی چینگ ینگ (Li Ching-Yung) چین کا فرتوت اعظم ہے، جو دنیا میں سب سے زیادہ معمر ہونے کا دعوی کرتا ہے، یہ شخص اب سے (۱۵۲) سال پہلے سو برس کی عمر تک پہونچ چکا تھا، کیونکہ اس کے خاندانی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۱۸۲۷ء میں حکومت چین نے باضابطہ طور پر اس کی عمر سو برس تسلیم کرلی تھی،

ان مثالون کو دیکھتے ہوئے علمائے سائنس کا خیال ہے، کہ انسانی عمر کی زیادہ سے زیادہ مدت ڈھائی سو سال قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کہ آیا اس مدت میں توسیع ممکن ہے یا نہین، یہ صحیح ہو کہ آج کل عمرین ڈھائی سو برس کی نہیں ہوتین، لیکن اوسط عمر میں برابر ترقی ہوتی جاتی ہو، ۱۸۰۰ء میں انسانی عمر کا اوسط صرف (۳۴) سال تھا، ۱۹۰۰ء میں (۳۸) سال ہوگیا اور ۱۹۳۰ء میں (۴۸) سال تک پہنچ گیا، علمائے حیاتیات کی رائے ہو کہ اگر اسی حساب سے یہ اوسط ترقی کرتا گیا، تو ایک وقت آئیگا جب یہ ۲۵۰ سال تک پہنچ جائے گا،

سائنسدانون کے سامنے اسوقت ایک دلچسپ سوال یہ ہے:- چونکہ انسانی دماغ کا اعادۂ شباب ممکن نہیں، نیز چونکہ دماغ "گھڑی کی کمانی" کے مثل ہے، جو لازمی طور پر کھلتی جائیگی، یہانتک بالآخر اس کا کھلنا موقوف ہوجائے گا، اسلئے کیا یہ ممکن ہے، کہ اس "کمانی" کے کھلنے کی رفتار سست کردیجائے، تاکہ "انسانی گھڑی" زیادہ دنون تک چل سکے؟

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جو حیوان جس قدر سست زندگی بسر کرتا ہے اتنی ہی زیادہ مدت تک زندہ رہتا ہے، مثلاً بڑے کچھوے کی عمر جو تمام حیوانوں میں غالباً سب سے زیادہ سست جانور ہے (۱۵۰) برس ہوتی ہے، یہی عمر کارپ (Carp) نامی ایک خاص قسم کی مچھلی کی بھی ہوتی ہے، جو اپنی زندگی کا بہت کچھ حصہ بے حس و حرکت گذار دیتی ہے، سفید سر کے گدھ کی عمر بھی جو بہت سست رفتار پرند ہے، اوسطاً (۱۱۸) سال ہوتی ہے، لیکن برخلاف اس کے ایسے جانور بھی ہیں، جو نہایت چست اور تیز رفتار ہیں، لیکن پھر بھی ان کی عمرین بہت طویل ہوتی ہیں، مثلاً گھڑیال، کوّا، اور سامن مچھلی، ان میں سے ہر ایک کی عمر سو برس ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ رفتارِ حیات اور مدتِ حیات کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں،

"ع ز"

اخبارِ علمیہ

بائبل کی تصحیح

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے بائبل کا وہ نسخہ جو رومن کیتھولک چرچ کا مستند اور باضابطہ نسخہ ہے، سنہ ۱۷۴۹ء کے بعد پہلی بار نظرِ ثانی اور تصحیح کے بعد مرتب کیا جارہا ہے، مدیروں کو توقع ہے کہ دو تین سال کے اندر عہد نامۂ جدید (New Testament) کی تصحیح مکمل ہوجائیگی، اسکے بعد عہد نامۂ عتیق (Old Testament) کا کام شروع ہوگا، جو نسخہ اسوقت رائج ہے، اسکو از سرِ نو بنانے کی ضرورت مدت سے محسوس کی جارہی تھی، کیونکہ اسکی زبان نہایت قدیم اور موجودہ نسل کے لئے بہت کچھ ناقابلِ فہم تھی، چنانچہ اس پر نظرِ ثانی کا فیصلہ امریکن کیتھولک چرچ کے سالانہ اجلاس مین نومبر ۱۹۳۵ء میں کرلیا گیا تھا، اس کے بعد بیس مستند علماء کی ایک مجلس نظرِ ثانی کے لئے مقرر کردی گئی اور اس مجلس نے نہایت خاموشی کیساتھ وہ کام شروع کردیا جو گذشتہ دو صدیوں کے اندر کیتھولک بائبل سے متعلق سب سے زیادہ انقلاب انگیز کام ہے، کام کی رفتار کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء تک عہد نامۂ جدید کے تقریباً نصف حصہ کا مسودہ اولیٰ مرتب ہوچکا ہے، نظرِ ثانی اور تصحیح میں قدیم اور متروک الفاظ کے بجائے جدید الفاظ لائے گئے ہیں، لیکن مجلس مذکور اس بات پر خاص طور سے زور دے رہی ہے، کہ بائبل کی زبان کی قدیم شان ضرور باقی رکھی جائے، اور عام بول چال کی زبان داخل کرکے اسکی ادبی شان کو ضائع نہ کیا جائے،

رومن کیتھولک چرچ کی پہلی باضابطہ بائبل ولگیٹ (Vulgate) کے نام سے مشہور ہے، یہ لاطینی زبان میں ہے، اسے پانچویں صدی عیسوی میں سینٹ جیروم (St. Jerome) نے اصل عبرانی اور یونانی مخطوطات سے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا، یہ نسخہ نہایت مقبول ہوا، لیکن سنہ ۱۴۵۶ء تک جب کہ گوٹن برگ (Gutenberg) نے اسے پہلی بار چھاپ کر شائع کیا، اس کے نسخے صرف قلمی تھے جنھیں راہب برسوں کی سخت محنت کے بعد تیار کرتے تھے، پندرھویں صدی میں چھاپہ کی ایجاد کے بعد اس کی بہت سی نقلیں شائع ہوکر تمام یورپ میں پھیل گئیں، لیکن چونکہ ان نقلوں میں بہت کچھ تحریفیں ہوگئی تھیں، اسلئے سولھویں صدی میں مجلس ٹرنٹ (Council of Trent) نے صرف ولگیٹ کو رومن چرچ کی باضابطہ اور مستند بائبل قرار دیکر تمام دوسرے نسخوں کا استعمال روک دیا، لیکن ولگیٹ میں بھی شروع کے کاتبوں نے بہتیری تحریفیں کردی تھیں، اور اصل متن میں بہت سی نئی چیزیں داخل کردی تھیں، اسلئے رومن چرچ کو اس نسخہ کی تصحیح بھی متعدد بار کرنی پڑی،

اگرچہ دوسری زبانوں میں اسکے ترجمے ہوچکے تھے، لیکن انگریزی زبان میں کوئی ایسا ترجمہ جو کیتھولک چرچ کے نزدیک قابلِ قبول ہو، سنہ ۱۵۸۲ء تک شائع نہیں ہوا، سنہ ۱۵۸۲ء میں ولگیٹ کے عہد نامۂ جدید کا پہلا مستند انگریزی ترجمہ رائمس (Rheims) سے شائع ہوا، جو فرانس میں واقع ہے، اور پھر سنہ ۱۶۰۹ء میں فرانس ہی کے ایک دوسرے مقام دوئے (Douai) سے عہد نامۂ عتیق کا ترجمہ نکلا، اسوقت کیتھولک چرچ میں جو انگریزی بائبل رائج ہے، وہ انہی دونوں نسخوں پر مشتمل ہے، تاہم نظرِ ثانی کی ضرورت سے یہ بائبل بھی محفوظ نہ رہ سکی، اور سنہ ۱۷۴۹ء میں کلیسا کے حکم سے پہلی بار اسکی تصحیح کی گئی، اب تقریباً دو سو برس کے بعد امریکن کیتھولک چرچ نے نظرِ ثانی کی ضرورت پھر محسوس کی ہے، معلوم نہیں اس صحیفۂ آسمانی کی قطع و برید کا سلسلہ کب ختم ہوگا،

سنہ ۸۱۱۳ء کے لئے ۱۹۳۶ء کی تہذیب کے نمونے،

قدیم مصریوں نے اپنی تقویم سنہ ۴۲۴۱ قبل مسیح سے شروع کی تھی، جب کہ شعری یمانی (Siriuo) جو تمام ستاروں سے زیادہ روشن ہے، آفتاب کے ساتھ طلوع ہوا تھا، عہد تاریخی کی ابتدا اسی سنہ سے ہوتی ہو، جس پر (۶۱۷۷) سال گذر چکے ہیں، اس زمانہ کے لوگوں کے حالات معلوم کرنے کا جو شوق ماہرین اثریات کو آجکل ہے، اس پر قیاس کرکے امریکہ کے ایک فاضل ڈاکٹر جیکبس (T. J. Jacobs) نے موجودہ تہذیب و تمدن کو ان لوگوں کے لئے محفوظ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، جو اب سے (۶۱۷۷) برس بعد یعنی سنہ ۸۱۱۳ء میں ہوں گے، چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک دلچسپ تجویز شائع کی ہے، اور اس پر عملدرآمد شروع بھی ہو گیا ہے، اوگلتھورپ یونیورسٹی (Ogle Thrope) سے متصل، جس کے صدر ڈاکٹر موصوف ہیں، پہاڑ کھود کر ایک تہ خانہ تعمیر کیا جا رہا ہے، جس میں سلیٹ کی استرکاری کی جائے گی، اس کا منہ پتھر سے بند کرکے فولاد کی ایک تختی لگا دی جائے گی، جس پر یہ عبارت کندہ ہوگی "آیندہ نسلوں سے درخواست کی جاتی ہے، کہ اس تہ خانہ کو سنہ ۸۱۱۳ء تک بند رہنے دیں"، یہ تہ خانہ حکومت ریاستہائے متحدہ اور اس کے جانشینوں کی امانت میں دے دیا جائے گا، اس میں ڈاکٹر جیکبس موجودہ تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں کے نمونے محفوظ کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ جو لوگ اب سے (۶۱۷۷) برس بعد آئیں، ان کو سنہ ۱۹۳۶ء کے طرز معاشرت سے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچ سکے، چنانچہ اس تہ خانے میں فونوگراف کے ریکارڈوں اور ناطق تصویروں کے ذریعہ اس دور کی بڑی بڑی شخصیتوں مثلاً پریذیڈنٹ روزولٹ، مسولینی، ہٹلر، اسٹالن وغیرہ کی تقریریں محفوظ کر دی جائیں گی، اور سینما کے پردوں پر سنہ ۱۹۳۶ء کے تمدن کی بہتیری چیزیں سنہ ۸۱۱۳ء کے ماہرین اثریات کے لئے چھوڑ دی جائیں گی، لیکن چونکہ موجودہ تمدن کی تمام چیزوں کو اس تہ خانہ میں جمع کر دینا ممکن نہیں ہے، اسلئے ڈاکٹر موصوف زیادہ تر انسائیکلوپیڈیا، ڈکشنری فوٹوگراف، نقشوں اور خاکوں کے ذریعہ ان چیزوں کو محفوظ کریں گے، چنانچہ وہ ناشروں سے درخواست کرنے والے ہیں، کہ اخباروں، رسالوں، اور کتابوں کے ایسے ایڈیشن تیار کریں، جن پر امتداد زمانہ کا کوئی اثر نہ پڑ سکے، کارخانوں سے کہا جائے گا، کہ وہ اپنے مصنوعات کے چھوٹے چھوٹے نمونے پیش کریں، سائنسدانوں سے دریافت کیا جائے گا، کہ یہ چیزیں (۶۱۰۰) صدیوں تک کیونکر خشکی، تری، گرد، اور دوسری خرابیوں سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں، اشیاء کے انتخاب کے لئے ججوں کی ایک کمیٹی مقرر ہوگی،

انڈے کی عمر،

بعض ڈچ سائنسدانوں نے ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے، جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انڈا کتنے دنوں کا ہے، وہ طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو الٹراوایولٹ روشنی (Ultraviolet ray) کے سامنے رکھئے، اگر انڈا تازہ ہے، تو اس سے سرخ روشنی نکلے گی، اگر بالکل تازہ نہیں ہے، تو اس کی روشنی کسی قدر نیلگوں ہوں گی، انڈا جس قدر پرانا ہوگا، اسی قدر نیلگوں رنگ زیادہ گہرا ہوگا،

باتیں کرنیوالی گھڑی

امریکہ کی ویسٹرن یونین ٹیلی گراف کمپنی نے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے، جو باتیں کرتی ہے، اس کی شکل بھی انسان کے چہرہ سے مشابہ ہے، ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ وقت بتاتی ہے، اور اس کے بعد فوراً کسی تجارتی مال کا اشتہار دیتی ہے، کمپنی مذکور ایک گھڑی ایسی بھی تیار کر رہی ہے، جو گانا گائے گی، یہ گھڑیاں فن اشتہار کا تازہ ترین نمونہ ہیں،

"ع، ز"

باب التقریظ والانتقاد

حمایتِ اسلام کا مطبوعہ قرآنِ پاک

پتہ:۔ حمایتِ اسلام لاہور، قیمت باختلافِ کاغذ وغیرہ

مسلمانون نے اپنی آسمانی کتاب کی جو لفظی و معنوی حفاظت کی، اور جس طرح اس کی ظاہری و باطنی آرایش وزیبایش کی کوشش کی، اور اسکی صحت کا اہتمام کیا، وہ کتبِ عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے، اون کی اسی حفاظت اور اہتمامِ صحت کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے، کہ قرآن پاک ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک رہا، جس پر مسلمانون کو بجا طور سے فخر ہے، مسلمان جب تک مسلمان تھے، اور ان کی سلطنتیں اسلامی سلطنتیں تھیں، قرآن پاک کی بصحت اشاعت کا کام اسلامی حکومتوں کا فرض تھا، اسی لئے اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ نے اسکو اسی غرض سے کتاب کی صورت میں محفوظ کیا، اور تیسرے خلیفہ نے اس مدنی اصل کی صحیح نقلیں دور دراز اسلامی ملکوں مین بھیجیں،

یہ تو اس عہد کی باتیں ہیں جب چھاپہ کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا، جب چھاپہ کا فن نکلا، اور کتابیں اس پر چھپنے لگیں، تو اسوقت قسطنطنیہ میں عثمانی خلافت قائم تھی، اوس نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور صحیح قرآن کی اشاعت کا فرض انجام دیا، نظارت معارف کی ماتحتی میں بڑے بڑے قاریوں اور حافظوں کی نگرانی اور تصحیح مین قرآن پاک چھاپے جاتے تھے، اور شائع کئے جاتے تھے، اونہی اشاعتوں میں سے حافظ عثمان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کا نسخہ مشہورِ زمانہ ہے، اور اس کے بعد حاجی شکر زادہ کا لکھا ہوا

قرآن ہے، جو سنہ ۱۲۴۶ھ میں سلطان محمود کے زمانہ میں چھپ کر وقفِ عام ہوا،

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ پر اسلامی امور و مناصب کی کس مپرسی کا عالم کسی سے چھپا نہیں، انہی میں سے صحیح قرآن کی طبع و اشاعت کا مسئلہ بھی ہے، مصر کی حکومت مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس نے سب سے پہلے اس فرض کا بوجھ اپنے ناتوان کندھے پر اٹھایا، اور تقریباً دس بارہ برس ہوئے کہ علماء و قراء کی ایک منتخب جماعت کی نگرانی میں بڑے اہتمام اور صحت کیساتھ قرآن پاک شائع کیا،

شاید پانچ برس ہوئے کہ مصر کے اسی نسخہ کو سامنے رکھکر افغانستان کی حکومت نے اپنے سرکاری مطبع میں قرآن پاک کے ایک نئے اڈیشن کا کام شروع کیا، سنہ ۱۹۳۳ء میں جب میں کابل گیا تھا، تو سرکاری مطبع میں اس قرآن کی صحت و طباعت کا کام مجھے دکھایا گیا تھا، اسوقت تک ایک ہی دو پارے چھپے تھے، اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر شائع ہو گیا ہے،

یہ داستان تو اسلام کے آزاد ملکوں کی تھی، ہندوستان میں یہ ہوا کہ شروع شروع میں جب تک مطبعون کی تصحیح کا اہتمام علماء کے ہاتھوں میں رہا، قرآن پاک کے بعض اچھے نسخے پرانے نظامی اور مصطفائی سے چھپ کر شائع ہوئے، گو وہ طباعت کے لحاظ سے کچھ اچھے نہ تھے، مگر صحیح تھے، لیکن جب سے تجارتی مطبع قائم ہوئے، اور تصحیح کا کام جاہلوں کے ہاتھوں میں آیا، قرآن پاک کا صحیح نسخہ ملنا تقریباً محال ہو گیا تھا، انتہا یہ ہے کہ وہ نامسلم بھی جو ایمان کی دولت سے محروم تھے، اسکو اپنے تجارتی مطبعوں میں چھپوا چھپوا کر دنیا کی دولت کمانے لگے، ان کے ہاتھوں اس کتاب پاک کی ظاہری و باطنی پاکی کا جو ستیاناس ہوا، وہ اہلِ خیر سے پوشیدہ نہیں،

اس خرابی کو محسوس سب کر رہے تھے، لیکن اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، ایسی حالت میں لاہور کی انجمن حمایتِ اسلام آگے بڑھی، اور اوس نے چند سال کی محنت اور ہزاروں روپیے کے صرف سے ایک عکسی قرآن پاک کی اشاعت کا بیڑا اوٹھایا، اور آخر ہندوستان مین

ایک غریب انجمن نے وہ کام کر دکھایا، جس کو دوسرے اسلامی ملکوں میں حکومتوں اور بادشاہوں نے انجام دیا، اس حسن خدمت پر انجمن کو جسقدر مبارکباد دیجائے وہ کم ہے،

انجمن کے اس مطبوعہ عکسی قرآن کا اہتمام ۱۳۴۹ھ سے شروع ہوا، ۱۳۵۴ھ میں چھپ کر پورا ہوا، یہ ظاہری و باطنی اور صوری و معنوی ہر قسم کی خوبیون سے ممتاز ہے، متوسط تقطیع کے ۲۰۰، صفحوں پر تمام ہوا، اس کا خط نسخ لدھیانہ کے مشہور منشی محمد قاسم مرحوم اور اُن کے صاحبزادہ منشی محمد شفیع صاحب کا لکھا ہوا ہے، یہ خط نہایت ہی شیرین اور اعلیٰ ہے، چھپائی کا یہ اہتمام ہے کہ پورے قرآن پاک کے ایک حرف میں بھی چھپائی کا داغ دھبہ نہیں، زیر زبر پیش اس طرح لگائے گئے ہین، کہ اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائیں تاکہ مبتدی اور کم سواد بھی غلط نہ پڑھ سکیں، ہر صفحہ کی جدول خوبصورت نقاشی سے آراستہ ہے، کاغذ سپید اچھا اور مضبوط ہے، ہر حرف دیکھنے میں موتی اور ہر سطر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی ہے، طباعت میں فوٹو لیتھو طریق استعمال کیا گیا ہے،

کتاب کی صحت کا یہ اہتمام ہے کہ انجمن کا اشتہار ہے، کہ غلطی نکالنے والوں کو فی غلطی ایک اشرفی انعام دیا جائے گا،

ان ظاہری اور معنوی خوبیوں کے علاوہ اس کے شروع میں رموز اوقاف پر ایک باب ہے، جس سے قرآن پڑھنے والوں کو آیات کے وقف و جواز و رخصت کی علامتوں کی تشریح ملے گی، جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں،

ان سب کے بعد اس نسخہ کی سب سے اہم خصوصیت دس فہرستوں کا اضافہ ہے،

۱- پہلی فہرست قرآن پاک کی منزلوں کی ہے، اُن لوگوں کے لئے جو قرآن پاک کو ایک ہفتہ یعنی سات دنوں میں تمام کرنا چاہتے ہیں، قاریوں نے سات مساوی حصوں میں قرآن پاک کو تقسیم کر دیا ہے، اس فہرست میں ہر منزل کے آغاز و اختتام کا نشان بقید صفحہ دیا گیا ہے،

۲- دوسری فہرست اجزاء (پاروں) کی ہے، جو لوگ ایک مہینہ یعنی تیس دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہتے ہیں، وہ قرآن کو برابر کے تیس پاروں میں بانٹتے ہین، اس فہرست میں ہر پارہ کے شروع اور آخر کے صفحات بتائے گئے ہیں،

۳- قرآن پاک کی اصلی تقسیم سورتوں کی ہے، تیسری فہرست سورتوں کی بحوالہ صفحات بہ ترتیب قرآنی ہے،

۴- چوتھی فہرست ان سورتوں کی بہ ترتیب نزول ہے،

۵- پانچوین فہرست انہی سورتوں کی بہ ترتیب حروف تہجی ہے، تاکہ سورتوں کا حوالہ آسانی کر ہر شخص کو مل سکے،

۶- چھٹی فہرست ہر سورہ کے رکوعوں کی ہے، یہ رکوع جن کو ہندوستان میں رکوع کہتے ہین، اصل میں عشرات ہیں، اور اسی لئے اس کا مخفف نشان قرآن پاک کے حاشیہ پر ع بنایا جاتا ہے، یہ کم و بیش دس دس آیتون کے ایسے ٹکڑے ہیں جن میں مضمون کا کوئی حصہ کسی نوع کا ختم ہوتا ہے، اسکو انگریزی اصطلاح میں پیراگراف سمجھنا چاہئے، یہ حصے اس لئے قائم کئے گئے ہیں، تاکہ قاری کسی سورہ کو مناسب حصوں میں بانٹ کر یاد کر سکیں، اور نمازی نماز میں اُن کو پڑھ سکین،

اس کے بعد ساتویں فہرست زاید الف کی، آٹھویں متقدمین کے اور نویں متاخرین کے مخالف رموز کی ہے، اور دسویں تلاوت کے سجدوں کی ہے، اور خاتمہ میں بیان اوقاف کا ایک مختصر عربی واردو باب شامل ہے،

ایک اور خوبی اس نسخہ کی یہ ہے کہ اس میں ہر سورت کی آیتوں پر نمبر لگا دیئے گئے ہیں، تاکہ ہر آیت کا حوالہ آسانی سے نکالا جا سکے،

امید ہو کہ مسلمان اس نادر نسخہ کی کماحقہ قدر کریں گے، اور اس کو جلد از جلد خرید کر اپنے کو اور انجمن کو دونوں کو فائدہ پہنچائیں گے،

"س"

"نقشِ ونگار"

از شاہ معین الدین احمد ندوی،

پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت :- غیر مجلد عہ، مجلد عہ

جناب جوش ملیح آبادی دورِ حاضر کے معروف شعرا میں ہیں، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے روحِ ادب کے نام سے شائع ہوا تھا، حال میں مکتبہ جامعہ ملیہ نے دوسرا مجموعہ نقش ونگار کے نام سے آراستہ کیا ہے، جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں مشہور افسانہ نگار ل احمد صاحب کا مقدمہ ہے جس میں جوش صاحب کے خاندانی حالات، انکی سرگذشت اور شاعری پر تبصرہ ہے، اسکے بعد اصل دیوان ہے، جو کلام کی نوعی تقسیم کے اعتبار سے پانچ حصوں پر منقسم ہے،

پہلا حصہ "نگارخانہ" اس میں شبابیات کے مختلف موثر مناظر، اور ان کے کوائف کے متعلق نظمیں ہیں، مثلاً "جوانی کی آمد آمد" "یار پری چہرہ" "نیچی نگاہیں" "جوانی کا تقاضا" اور "حسن بیمار" وغیرہ، دوسرا حصہ خمریات کا ہے، انکی جنس انکے نام سے ظاہر ہے، تیسرا حصہ "تاثرات" اس میں ان مختلف النوع تاثرات کے متعلق نظمیں ہیں جن سے شاعر مختلف حالات میں اثر پذیر ہوا، اس لئے شبابیات کے ساتھ دوسرے موثر منظومات، مثلاً "مفلسوں کی عید" "غریب الوطن کا پیام" اور "وطن کی یاد" وغیرہ ہیں، چوتھا حصہ مطالعہ و نظر، اس میں وہ قطعات ہیں جن میں کسی شاعرانہ تصور، جذباتی تخیل یا اخلاقی اور حکیمانہ خیال کا اظہار کیا گیا ہے، پانچواں نشیب، اس میں مختلف شاعرانہ تصورات، عاشقانہ خیالات اور احوال و کوائف پر نظمیں ہیں،

جوش کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے منفرد شان رکھتی ہے، وہ اس دور کے ان شعرا میں ہیں جنکی شاعری ایک خاص رنگ رکھتی ہے جسے اصطلاحی معنوں میں نہ تغزل ہی کہا جاسکتا ہے، اور نہ خالص نظم لیکن وہ غزل سے زیادہ شوخ اور نظم سے زیادہ مربوط و مسلسل اور ان دونوں کے اصطلاحی مفہوم سے وسیع تر ہے، اسکو خارجی کیفیات کی مصوری یا آج کل کی زبان میں "شبابیات" سے تعبیر کرسکتے ہیں، ان کی پوری شاعری اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے،

ان کی شاعری میں شوخی و رنگین بیانی کی بے اعتدالی کے باوجود شاعری کے تمام اجزاء و عناصر پائے جاتے ہیں، جو طبائع متغزلانہ شوخی اور بانکپن کو پسند نہیں کرتے، اور صرف مجرد عن المادہ حقائق پر سر دھنتے ہیں، اور اسی کو معیار کی بلندی اور حسنِ مذاق سمجھتے ہیں، ان کے لئے تو شاید یہ رنگ زیادہ خوش آئند نہیں ہوسکتا، لیکن متغزلانہ شوخیوں کو رخسارِ شاعری کا غازہ سمجھنے والوں کے نزدیک شاعری یہی ہے، لیکن کبھی کبھی ان کی شوخی اعتدال سے بڑھ کر بدنما حد تک پہنچ جاتی ہے،

پہلی خصوصیت، جوش کی شاعری میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جنھیں انکا طغرائے امتیاز کہنا چاہئے، ان میں سب سے نمایاں انکی شوخی و رنگین بیانی ہے، ان کی شاعری سراپا رنگ و بو ہے، ان کا ہر تخیل اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، حتی کہ وہ مرثیہ بھی غزل کے رنگ میں کہتے ہیں، اور نالہ بھی ترانہ کی لے میں کرتے ہیں، چونکہ ان کی پوری شاعری اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے، اسلئے اسکے مخصوص نمونے کی پیش کرنیکی ضرورت نہیں، آئندہ مختلف نمونوں سے اس کا اندازہ ہوگا،

دوسری خصوصیت نظم مسلسل، دوسری خصوصیت نظم مسلسل ہے، اردو شاعری پر نئی جماعت کا یہ بڑا اعتراض تھا، کہ اس کا دامان تنگ نظم مسلسل سے بالکل خالی ہے، جوش کی شاعری نے اس اعتراض کو دور کردیا، انکا پورا دیوان نظم مسلسل ہے، اس لئے کسی خاص نظم کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس دور میں جوش اور سیماب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو مستقل موضوع سخن بنایا، اور ہر صنف اور ہر رنگ میں اس کثرت کے

ساتھ نظمین لکھین کہ ان سے پورا دیوان مرتب ہوگیا،

تیسری خصوصیت محاکات یا منظر کشی،

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ محاکات منظر کشی اور مصوری کے جتنے بہتر نمونے جوش کے کلام میں ملتے ہین، اس کی مثال دوسرے شعراء کے یہاں نہیں مل سکتی، اسلئے کہ منظر کشی اور مصوری کی جتنی وسعت مسلسل نظم میں ہے، وہ فرد اشعار اور قطعات میں ممکن نہیں، وہ نہ صرف مناظر اور سراپا کے مصوّر ہیں، بلکہ جذبات کی مصوری میں بھی انکو دسترس حاصل ہے، مناظر کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، گنگا کے گھاٹ پر:-

بڑھائے سرخی عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے،

سرادلائی کا سر پہ نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے

لبون پہ مہر خموشی خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ جبیں پر دمک نظر میں شراب

شراب ناب لئے نرگسی کٹوروں میں،
لہو جمن کا رواں سرخ سرخ ڈوروں میں

دراز زلف میں جادو سیاہ آنکھ میں مدہ
نسیم صبح بنارس ہلال شام اودھ

جمنا کے کنارے:-

اک قصر قریب رود جمنا،
لہروں کو بنا رہا ہے بینا،

اس قصر کے بام پر کھلے سر،
اک زہرہ جبین و ماہ پیکر،

نوخیز و حسین بلند و بالا،
اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا

افسون بہ نگاہ زلف بر دوش
غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش

فردوس کے در کئے ہوئے باز
ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز

رنگین کلائیوں کو جوڑے
چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے،

گلدان میں پھول ہنس رہا ہے
قرآن ہے کہ رحل پر دھرا ہے

نیچی نگاہیں:-

آہ یہ نیچی نگاہیں اے نگار شرمگیں،
عشق اس کا فرحیا کی تاب لا سکتا نہیں

سرخ آنچل کا ڈھلک جانا وہ سے سر بار بار
دونوں ہاتھوں کو چھپا لینا وہ منہ سے اختیار

عارض گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا
یہ تبسم جو طلوع صبح سے ملتا ہوا

گفتگو یہ سر جھکا کے شرمگیں انداز سے
یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

حسن بیمار:-

کیا غضب ہے حسن کے بیمار ہونیکی ادا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

انکسار حسن پلکون کے جھپکنے میں نہان
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروت سی عیان

چوڑیاں ڈھیلی کلائی پر شکن ماتھے پہ ہے
لب پہ خشکی رخ پہ سوندھا پن نظر میں التفات

ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار پر یوں نور کی
جیسے گل پر صبح کاذب کی سہانی چاندنی

ایسے اضمحلال پر دنیا کی برنائی نثار
ایسی بیماری پہ اعجاز مسیحائی نثار

چوتھی خصوصیت، خمریات

بادۂ احمر کا رنگ و ذائقہ ایسا دلکش اور پر کیف ہوتا ہے، کہ زاہد شعراء تک کا دامن اسکے چھینٹوں سے محفوظ نہیں، کچھ نہ سہی تو زبانی ہی ذکر سے لذت گیر ہو لیتے ہیں، اسی لئے کسی شاعر کا کلام اس رنگین ذکر سے خالی نہیں، کچھ نہیں تو کلام کی خوش منظری کے لئے اسکے چھینٹے ہی دیدیتے ہیں، جوش اول تو شاعر پھر صاحب حال اسلئے ان کے یہاں اس سیال احمر کی نہریں رواں ہیں، اور یہ شے ان کے کلام کے خصوصیات میں سے ہوگئی ہے، اور چونکہ وہ صاحب حال ہیں، اس لئے ان کی گفتگو اس کے ظاہری رنگ و بو تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے ناقابل بیان احوال و کوائف بلکہ مقامات تک کی تصویر دکھا دیتے ہیں، اس نوع کی نظمیں بڑی مست اور پر لطف ہیں، خصوصاً چند جرعے میں سرخوشی، مستی، سرمستی اور بیخودی وغیرہ کے جو مدارج و کوائف دکھائے گئے ہیں، وہ صرف

صاحب حال ہی دکھا سکتا تھا، افسوس ہے کہ خمریات کی تمام نظمیں نہایت طویل ہین، اسلئے ہم اُن کو نقل نہیں کر سکتے، صرف "چند جرعون" کے چند قطرات پیش کرتے ہین، پہلے جرعے کا اثر:۔

کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے   لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے،
یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ   رگوں میں ہو رہی ہے کیسی سنسناہٹ
چمکتی ہیں فضا میں بجلیاں سی   لچکتی ہے رگ و پے میں کمان سی

دوسرے جرعے کا اثر:۔

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی   ہر اک لمحہ ہے عمر جاودانی
گھٹا سی اک سنہری چھا رہی ہے،   پھریری سی پہ پھریری آ رہی ہے،
کبھی ظلمت کبھی انوار مہتاب،   خدا معلوم بیداری ہے یا خواب

تیسرے جرعے کا اثر:۔

ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے،   سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے،
ابلتی ہے شراب ارغوانی   برستا ہے مزے لے لے کے پانی
سر میخانہ روحیں آ رہی ہیں،   نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں،   بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں

چوتھے جرعے کا اثر:۔

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری   ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
زمیں اس وقت اک وہم و گماں ہے،   میرے شہپر کے نیچے آسماں ہے،

نہ دل کو امتیاز این و آں ہے،
نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے،

پانچویں جرعے کا اثر:۔

تعالی اللہ شکست خود نمائی،   بھرا ہے خاک میں زور خدائی،
فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے،   زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے،
ملک حسرت سے منہ کھولے ہوئے ہے   زمیں اڑنے کو پر تولے ہوئے ہے،
فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں   پیامی آ رہے ہیں جا رہے ہیں
نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں   نقابیں اٹھ رہی ہین گر رہی ہیں،
اگر چاہون تو دنیا کو ہلا دون   زمیں کیا آسمانوں کو نچا دون

فلک کیا عرش کو بھی مست کر دون
خودی کیسی خدا کو مست کر دون

مذاق کے اعتبار سے شاعری کا رنگ، جوش کسی خاص رنگ شاعری کے متبع نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی ہے، اسلئے کسی خاص رنگ و مذاق کی شاعری سے انکا موازنہ صحیح نہیں ہے، پھر بھی وہ نواح لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، اور اسی ماحول میں اُنکی نشو و نما ہوئی ہے، اسلئے زبان و بیان اور جذبات کی ترجمانی میں لکھنؤ کا اثر غالب ہے، تاہم بڑی حد تک ان کا کلام لفظی رکاکتون سے پاک ہے، لکھنؤ کے اثرات کی بعض مثالیں ملاحظہ ہون،

اے زہرہ جبینوں کے لئے یک بہ تربیت   پیغام بر فتح و ظفر کس کے لئے ہے،
اے تجھکو ملے عمر مری شام بلا کی   یہ زلف رسا تا بکمر کس کے لئے ہے،
اے قامت بالا و بلند اے قد موزوں   یہ سرو یہ شاخ گل تر کس کے لئے ہے،
اے حسن رخ روشن و اے جلوۂ کاکل   یہ ہوش ربا شام و سحر کس کے لئے ہے

آ رہی ہو باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی   مسکرانے میں لبون سے پھول برساتی ہوئی

پاؤں رکھتی نازسے شبنم کے قطروں کی طرح — سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو چونکاتی ہوئی،
بجیر خود اپنے ہی سے کرتی ہوئی مستانہ وار — ہر قدم پر کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
ہائے کیا گوری کلائی میں ہر لچھا دلفریب — ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہر ستم ڈھاتی ہوئی

کیوں صبح یوں عرق میں نہائے ہوئے ہو تم — شاید کسی خلش سے جگائے ہوئے ہو تم
الجھا ہوا ہے کرب سے یہ رشتۂ نفس — گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم
شاید یہ اہتمام ہو اخفاے راز کا — ہجولیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم
خود کو لئے ہوئے ہو مگر کہہ رہی ہیں طور — سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

المیہ رنگ اگرچہ جناب جوش محض نشاطی شاعر ہیں، اور ان کی ہر لے سے نشاط ہی کا نغمہ نکلتا ہے، لیکن ایک شاعر کا دل یکسر درد والم کی لذت سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے جناب جوش کی شاعری اس جنس گرانمایہ سے بالکل تہی مایہ نہیں، لیکن المیہ رنگ ان کیفیتوں سے آگے نہیں بڑھتا،

نقش خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز — بیدرد میں نے تجھکو بلایا نہیں ہنوز
یادش بخیر جس پہ تری تھی کبھی نظر، — وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز
وہ سر جو تیری راہگذر میں تھا سجدہ ریز — میں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز
محراب جان میں تونے جلایا تھا خود جسے — سینے میں وہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز
دنیا نے تجھکو خواب گراں سے جگا دیا — لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز
بیہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آگیا، — میں بدنصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

چھٹ گو جب آپ ہی اودی گھٹا چھائی تو کیا — تربت پامال کے سبزے پہ لہرائی تو کیا
جب ضرورت ہی رہی باقی نہ کچن ورنگ کی — کوئلیں کوکیں تو کیا ساون کی رت آئی تو کیا
ہو چکی ذوق تبسم ہی سے جب بیگانگی — اب چمن افروز پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا

غنچہ عہد طرب ہی مل چکا جب خاک میں، — خاک گلشن اب گل تر بن کے اترائی تو کیا،
آنسوؤں میں بہ گئیں جب خون کی جولانیاں — جنگلوں کی چھاؤں میں برسات اٹھلائی تو کیا

اب خانۂ امید میں ظلمت بھی نور ہے، — تکلیف اہتمام چراغاں نہ کیجئے،
دیکھے ہوئے ہوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ — اب خارزار دل کو گلستاں نہ کیجئے،
چھایا ہوا ہے مطلع امید پر غبار — اب کاکلوں کو رخ پہ پریشاں نہ کیجئے،
اقرار اولیں کا جنازہ ہے دوش پر — اب تازہ رسم کہنۂ پیماں نہ کیجئے،
جس دل پہ ناز تھا وہی باقی نہیں رہا — اب زندگی سے مجھ کو پشیماں نہ کیجئے

زبان پر قدرت، جوش کو زبان پر غیر معمولی قدرت ہے، وہ جس رنگ اور جس نوع کی زبان چاہتے ہیں بے تکلف استعمال کرتے ہیں، اور جس مفہوم کو جس رنگ میں چاہتے ہیں، ادا کرتے ہیں، ان کا کلام ہمہ رنگی کے باوجود مختلف النوع ہے، اور ہر نوع کے لئے انھوں نے ٹھیک اسکے مطابق زبان استعمال کی ہے، اسی لئے ہر رنگ کی زبان کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں، وہ الفاظ سے ہر منظر ہر کیفیت اور ہر مفہوم کی صحیح تصویر کھینچ دیتے ہیں، ان کی قادر الکلامی کے ثبوت میں ان کی نظم "کوہستان دکن کی عورت" پیش کیجاتی ہے، اس نظم میں انھوں نے کوہستانی عورت کے طغیان شباب اور اس کی سنگلاخیت کو اس طرح دکھایا ہے، کہ اسکی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، یہ نظم طویل ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں — سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
یہ سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل — اتنی بے پایاں صلابت پھر بھی ہر نقشہ سجل
چال جیسے تند چیتے، تیوریاں جیسے غزال — عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کا خواب — پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب
جسم ہیں کچھ اسقدر ٹھوس الحفیظ والاماں — لیجئے چٹکی تو جھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی اٹھی سی کلائیں آہن و فولاد کے پٹھے سلاخوں کی رگیں،

ان بناہ شکوہ کی کڑیل جوانی الاماں، پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جوان

اس سنگلاخ کوہستان کے بعد ذرا ان پھولوں کی نزاکت دیکھئے،

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں ناز پرور پھول شگفتہ پھول جواں پھول خلد پیکر پھول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے سبک غنچے شمیم زلف سے مہکے ہوئے معطر پھول

شعاع حسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے لب نگار کے چومے ہوئے مخمور پھول

نسیم کاکل شبگوں سے پرفشاں گل برگ فروغ نرگس شیریں سی خواب آور پھول

ارم سے آئی ہوئی حرف آرزو کلیاں خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

فارسی آمیز زبان، وہ ایسی زبان بھی اسی شیرینی کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ سراسر قند پارسی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے، فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے نمونے تو ان کی تمام نظمیں ہیں، بعض بعض نظموں میں تو مشکل سے دو چار الفاظ ہندوستانی زبان کے نکل سکتے ہیں،

زاہد فریب گل رخ کافر دراز مژگان سیمیں بدن پری رخ نوخیز حشر سامان

خوش چشم و خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر نازک بدن شکر لب شیریں ادا فسوں گر

کافر ادا شگفتہ گل پیرہن سمن بو سرو چمن سہی قد، رنگیں جمال خوشتر

ابرو ہلال مے گوں جان بخش و روح پرور نسریں بدن پری رخ سیمیں عذار دلبر

غارتگر تحمل دلسوز دشمن جان، پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیابان،

گلشن فروغ کمسن مخمور ماہ پارا، "دلبر کہ در کف او موم است سنگ خارا"

سادہ زبان، اگرچہ ان کی زبان پر فارسیت غالب ہے، پھر بھی وہ سادہ زبان پر بھی قادر ہیں، چنانچہ بعض نظمیں ان کی ایسی بھی ہیں، جن میں مشکل سے دو چار فارسی الفاظ مل سکتے ہیں،

یہ کون اٹھا ہے شرماتا رین کا جاگا نیند کا ماتا،

نیند کا ماتا دھوم مچاتا، انگڑائیاں لیتا بل کھاتا،

یہ کون اٹھا ہے شرماتا،

رخ پر سرخی آنکھیں جادو بھینی بھینی بر میں خوشبو

بانکی چتون سمٹے ابرو نیچی نظریں بکھرے گیسو،

یہ کون اٹھا ہے شرماتا،

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی،

آنچل ڈھلکا مسکی ساری ہلکی مہندی دھندلی بندی

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

جوش کی خامیاں، جوش کی قادر الکلامی اور فطری شعریت کے باوجود ان کی شاعری اسقام اور خامیوں سے یکسر خالی نہیں ہے، اگرچہ ان کا کلام گلہائے رنگیں کا ایک خوشرنگ گلدستہ ہے لیکن ان کے تغزل اخیالات میں لطافت اور پاکیزگی کی بڑی کمی ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ اسی عالم آب و گل کی باتیں کرتے ہیں، اور درحقیقت یہی شاعری ہے، میں خود مجرد عن المادہ تصورات کو شاعری نہیں سمجھتا لیکن اسے ماننے کے بعد بھی اسی عالم میں بعض مقامات اور کوائف ایسے ہیں، جہاں انسان عشق کی مادی رنگینیوں سے تھک کر اور الگ ہو کر اسی کے لطیف نشہ سے روحانی کیف و سرور حاصل کرتا ہے، کیا جوش صاحب کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا، اس کمی کی وجہ سے ایک صاحب ذوق طبقہ کو انکی شاعری میں اپنی تشفی کا بہت کم سامان ملتا ہے، ان کی شاعری خوش رنگ و خوش منظر ہے لیکن پرتاثیر نہیں،

دوسری خامی انداز بیان کی ہے، وہ زبان پر پوری قدرت کے باوجود کہیں کہیں بے محل الفاظ اور بے جوڑ ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں، مثلاً لب دریا ایک محل کی تعریف میں، ع لہروں کو بنا

ہے بنیا"، لہرون کو بینائی سے کیا تعلق، اگر بنیا کا مفہوم یہ ہے، کہ موجون مین مقابل کی چیزون کا عکس پڑتا ہے، اس لئے گویا وہ اسکو دیکھتی ہین، تو یہ مفہوم بینا سے ادا نہیں ہوتا،

اور یون کہ قریبِ لب ذرا سا — عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ،

اس حلقۂ دل نشین کے اندر — غلطیدہ ہیں ناز کے سمندر،

ناز کا تعلق اعضا، وجوارح کے حرکات اور نطق سے ہے، حلقۂ عارض کو ناز سے کوئی علاقہ نہیں، پھر "ناز کے غلطیدہ سمندر" بھی درست نہیں،

ع :- کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا، نرمی آنچل کی کوئی صفت نہیں ہے، ہان کپڑے کی ہو سکتی ہے، مگر دونون کے مفہوم جداگانہ ہین،

جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زُلفِ پریشان پر — زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسارِ تابان پر

اس شعر میں چند در چند خامیان ہین، اوّلاً زمرد کے ورق نہیں ہوتے، دوسرے زلف کی تشبیہ زمرد سے دینا صحیح نہیں، کہ دونون رنگوں میں کوئی مناسبت نہیں، زمرد سے امردون کی سبزہ رُخی کی تشبیہ البتہ دیجاتی ہے، لیکن اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو رخسارِ تابان پر زمرد کے ورق چڑھنے کے کوئی معنی نہیں، یہ تشبیہ بھی امردون کی سبزہ رخی کی تشبیہ کے التباس کا نتیجہ ہے،

ع :- یون ہو اک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز مین، روشن نمی بے جوڑ سی ترکیب ہے ع منہ ڈھانپنے لگتا ہے بافراطِ ندامت، فرط کے بجائے افراط درست نہیں ہو ع، اسکے لفظوں سے ہو بچپن کا تلاطم آشکار، بچپن کی شرارتون کے لئے تلاطم صحیح نہیں ہے، ع، شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیاں میدان میں، کھوکھلی تاریکیان بالکل بے معنی اور غیر مانوس ترکیب ہے ع نظریں مضمحل ہین جشمگین اگلے زمانہ کی جشنون کے اضمحلال کے کیا معنی، ع، تارون کی کشمکش مین جب چاندنی ہو بھیگی، تارون کی کشمکش میں چاندنی بھیگی ہونے کا کیا مطلب ہو، بلکہ چاند کی روشنی سے تو خود تارون کی چمک مدھم پڑ جاتی ہو،

ع :- جلوون کی ہے چھوٹ خار و خس پر، جلوون کی چھوٹ کے کیا معنی، اگر اس کا مقصد ان کے ظہور کی کثرت یا فراوانی ہے، تو جلوون کی لطافت "چھوٹ" کی کثافت کی متحمل نہیں ہو سکتی،

آنچل سنبھالنے میں یون بل سی کھا رہی ہے — گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے،

آنچل سنبھالنے میں بل کھانے کی کیفیت کی تشبیہ انگڑائی سے بالکل غلط ہے، اس لئے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں،

کسے معلوم تھا اک روز ہو گی سرگرانی بھی — دبے پاؤں چلی آتی ہو تیزی سے جوانی بھی

اس شعر میں پاؤں کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہوتا، پھر "دبے پاؤں" اور "تیزی" میں تضاد ہے،

شعلے وہ سرخ سرخ دلوں میں تلے ہوئے — وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے،

اس شعر کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے،

دیوان کے تھوڑے سے حصے پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ خامیان دل میں کھٹکتی ہیں، اگر لیتقات کے ساتھ پورا دیوان تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو اور بھی خامیاں نکلیں گی، لیکن ان سے جوش کے شاعرانہ کمال پر حرف نہیں آتا، اسلئے ان کے کمالات کے مقابلہ میں یہ فروگذاشت بہت خفیف ہے، اس کے اظہار کا مقصد یہ ہے، کہ ان کے جیسے قادر الکلام کے کلام میں یہ خفیف فروگذاشتیں بھی کھٹکتی ہیں،

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اسکی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعرا کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہو جسمیں آبِ حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہو، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۰ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

میری کہانی (دو جلد) مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو تقطیع چھوٹی ضخامت ایک ہزار صفحات سے کچھ زیادہ کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے گذشتہ ایام اسیری (سنہ ۱۹۳۴ء سنہ ۱۹۳۵ء) میں جیل کی خاموش اور پرسکون زندگی میں اپنی سوانحمری انگریزی میں لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب مکتبہ جامعہ ملیہ نے اس ضروری اور اہم کتاب کا ہندوستانی ترجمہ شائع کیا ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، پنڈت جی کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسی میدان میں گذرا ہے، اس لئے ان کی سوانح عمری گویا ہندوستانی سیاست کی سرگذشت ہے، چنانچہ چند ابتدائی ابواب کے بعد ہی جس میں ان کے خاندانی اور تعلیم وغیرہ کے حالات ہیں انکی سیاسی زندگی کے حالات شروع ہو جاتے ہیں، جس میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک کی ہندوستان کی سولہ سالہ سیاسی جد وجہد، اسکے مد وجزر اور انقلابات وحوادث کی اجمالی سرگذشت ہے، اس میں واقعات ماضی کے علاوہ سیاسیات کے تمام متعلقہ مسائل، پنڈت جی کے خیالات ومعتقدات، جیل کی زندگی اور سفر یورپ کے حالات، مختلف سیاسی مسائل اور طبقات پر ان کی رائیں اور تنقیدیں اور اسی قبیل کے بہت سے اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں، اس سلسلہ میں حکومت، عمال حکومت، سیاسی جماعتوں اور اشخاص پر ان کی سنجیدہ اور بعض ظریفانہ تنقیدیں خصوصیت کیساتھ نہایت دلچسپ ہیں، جنکی توقع ایک سیاسی قلم سے کم ہو سکتی تھی، ان خالص سیاسی مسائل کے علاوہ ہندوستانی زندگی اور معاشرت کے اور بہت سے پہلوؤں پر پنڈت جی کے افکار وخیالات ملتے ہیں، پوری

کتاب بے باک صداقت کا نمونہ ہے، ممکن ہے کہ ان کے تمام خیالات ہر جماعت کے لئے قابل قبول نہ ہوں لیکن ان کی صداقت میں کوئی کلام نہیں، ان کی صداقت کا یہ ادنی نمونہ ہے کہ اونھوں نے اپنے والد اور گاندھی جی پر بھی جنکو وہ والد سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں بے لاگ تنقید میں باک نہیں کیا ہے، ان مسائل کے علاوہ پنڈت جی کی سیرت کا مطالعہ اس کتاب کا ایک دلچسپ باب ہے جس میں انکی اعلٰی سیرت، انکی بلند نظری، عالی ظرفی، شرافت نفس، سادگی، جفاکشی، ضبط نفس، شاعر مزاجی، ظرافت، زندہ دلی اور شریفانہ بھولے پن کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، پنڈت جی نے اس کتاب میں ایک موقع پر اپنے متعلق یہ ظریفانہ جملہ لکھا ہے کہ مجھ پر علم وفضل کا اتہام کبھی نہیں لگایا گیا لیکن اس کتاب کی ہر سطر اسکی تردید کر رہی ہے، انھوں نے تحریر کی دلکشی سے اس خشک کتاب میں افسانے کا لطف پیدا کر دیا ہے، اور مترجم کی شگفتہ نگاری اور شوخی قلم نے نقل کو اصل کے برابر کر دیا،

غالب، مؤلفہ جناب مولوی غلام رسول صاحب مہر مدیر روزنامہ انقلاب تقطیع بڑی ضخامت ۳۷۹ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں غالباً دفتر انقلاب لاہور سے ملے گی،

ہماری بزم دوشینہ کے ارباب کمال میں مرزا غالب کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ اس دور کے کسی صاحب کمال کے حصہ میں نہ آیا ہوگا، ان کی ذات ادیبوں کا موضوع بحث بن گئی ہے، اور ان کی مختلف حیثیات پر اب تک تحریر وتقریر اور تحقیق وتنقید کا سلسلہ جاری ہے، ان کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، ان سب میں مذکورالصدر کتاب ایک انوکھی کوشش اور ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے، اس میں خود غالب کی فارسی اور اردو نظم ونثر سے ان کی پوری سوانح عمری تیار کی گئی ہے، اس اہتمام سے اگرچہ مرزا غالب کی سوانح کے ماخذ بہت محدود ہو جاتے ہیں پھر بھی اتنے محدود اوراق سے ریزہ چینی کرکے مستقل سوانحمری مرتب کر دینا بڑی دیدہ ریزی کا

کام تھا، جس کا درجہ تزک سے کم نہیں، عموماً اس قسم کی کوششیں سرسری اور تشنہ ہوتی ہیں، لیکن
اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ وہ مرزا غالب کی زندگی کے جملہ اہم اور ضروری واقعات پر حاوی ہے،
اور ان کے نسب، خاندان، پیدائش، طفولیت، تعلیم، شادی، خانگی زندگی، اعزہ، احباب، متوسلین، دہلی
کی سکونت، مکان، کلکتہ، رام پور، اور میرٹھ کے سفر، پنشن کے مقدمے کی تفصیلی روداد، اسیری، ممدوحین،
مدح گوئی، صلہ یابی، حالات غدر، خانگی پریشانیاں، عوارض بیماریاں، وفات، اخلاق وعادات اور
تصانیف وغیرہ، ان کی زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق مفصل حالات ہیں، ان ذاتی حالات
کے علاوہ بہت سے ضمنی واقعات بھی آگئے ہیں، مصنف نے جابجا یادگار غالب کے بیانات سے
اختلاف کیا ہے، جو غالب ہی کی تحریروں پر مبنی ہے، بعض پیچیدہ مسائل کو جو غالب کی مختلف تحریروں
سے پیدا ہوتے ہیں، خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے، غالب کی تصانیف پر تفصیلی تبصرہ
خصوصیت کیساتھ مفید اور پر از معلومات ہے، غالب کی تحریروں کے علاوہ بعض بعض مقاموں پر سرکاری
دستاویزوں اور بعض مستند زبانی روایات سے بھی مدد لی گئی ہے، غرض یہ مستند سوانح عمری ہندوستانی
زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، ہم مہر صاحب کو ان کی کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں،
ہم کو معلوم نہ تھا کہ یہ نام کے مہر صاحب علم وادب کے مہر تاباں بھی ہیں،

گلستان امجد، (ترجمہ گلستان سعدی) مترجمہ حکیم الشعراء سید امجد حسین صاحب
امجد حیدرآبادی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت نفیس
ودیدہ زیب، قیمت ۲ر پتہ، مستعد پورہ کاغذی گوڑہ مکان نمبر ۲۶۹۵ عماد پریس
چھتہ بازار حیدرآباد دکن،

فارسی زبان کی کتابوں میں گلستان سعدی کو دنیا میں جو شہرت ومقبولیت حاصل ہے،
وہ محتاج بیان نہیں، شاید ہی دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی ہو جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو،

ہندوستانی میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے، لیکن وہ محض طلبہ کے استفادہ کے لئے کئے گئے تھے، اسلئے اولاً متن کے بعینہٖ
سب نکتے ہیں، جن میں گلستان فصاحت کا قائم رکھنا تو کجا، ان کا سمجھنا بھی مشکل ہے، حکیم الشعراء امجد صاحب نے
جن کو خدا نے زبان کی ساحری کیساتھ قلم کی فسوں کاری بھی عطا کی ہے، اس کمی کو اس خوبی اور کمال
کے ساتھ پورا کیا ہے، کہ گلستاں کو اسکو سارے رنگ وبو کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ڈھال
دیا ہے، وہی چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، وہی فصاحت وبلاغت ہے، وہی روانی ہے، وہی حلاوت
شیرینی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ موتی ہیں کہ ڈھلکتے جاتے ہیں، قند ونبات کی ڈلیاں ہیں، کہ کام و
دہن کو حلاوت بخشتی ہین، سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ گلستاں کی نظم کے منثور ترجمہ کے بعد اسکے ہم معنی یا
اس سے ملتی جلتی ہوئی اپنی نظم بھی اس طرح کھپا دی ہے، کہ معلوم ہوتا ہے، کہ حریر وپرنیان میں موتی
ٹکے ہین،

سخنستان، مرتبہ پنڈت رام گوپال صاحب مصر، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۴ صفحات،
کاغذ، کتابت نفیس ونظر فریب، جلد خوبصورت چمکدار، قیمت عام لوگوں کے لئے صر،
شعراء کے لئے عہ، پتہ پنڈت رام گوپال صاحب مصر ڈپٹی کلکٹر، بلیا یوپی،

پنڈت رام گوپال مصر ڈپٹی کلکٹر کے قیام گورکھپور کے زمانہ ۱۹۳۲ء میں ان کے اہتمام میں وہاں
ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا، سخنستان اسی مشاعرہ کی غزلوں کا گلدستہ ہے، ابتدا میں پنڈت
رام گوپال صاحب کے قلم سے مشاعرہ کی مختصر روداد ہے، اس کے بعد ۸۳ شعراء کی غزلیں، ان
کے مختصر حالات اور بعض کے فوٹو ہیں، چونکہ پنڈت جی خود ایک باذاق شاعر ہیں، اس لئے اس گلدستہ
کے آراستہ کرنے میں انھوں نے بڑے حسن مذاق سے کام لیا ہے، اور اسکو کلام کی رنگارنگی کے ساتھ
ظاہری نفاست اور پاکیزگی کا مرقع بنا دیا ہے،

نسیم عرفان، مصنفہ مولانا عبد القدیر صاحب حسرت صدر شعبۂ دینیات کلیہ جامعہ

عثمانیہ، تقطیع چھوٹی، حجم ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مذکور نہیں، پتہ:۔ سید منظر علی شوکت، محلہ رکاب گنج، عقب، ڈیوڑھی، غالب جنگ، مکان نمبر ۴۴۴ و مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد دکن،

نسیم عرفان مولانا عبد القدیر صاحب حسرت کے کلام کا اسم بامسمی مجموعہ ہے، اس مختصر دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مسدس، رباعیات، ٹھمریاں ہر قسم کے نمونے ہیں، اور کوئی لطف سے خالی نہیں، غزلوں کا ظاہری رنگ عاشقانہ ہے، لیکن رنگ حقیقت میں ڈوبا ہوا، نعتیہ ٹھمریاں خصوصیت کے ساتھ زیادہ پر کیف ہیں،

ابصار العینین فی شہادت الحسین } مولفہ مولانا لطیف الدین صاحب مدرس مدرسہ نظامیہ فرنگی محل، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت [illegible]، پتہ سلیم الدین احمد صاحب احاطہ خانساماں متصل باغ مولوی انوار صاحب لکھنؤ،

شیعہ سنی مناظروں نے اب یہاں تک نوبت پہنچا دی ہے، کہ بعض سنی بھی شیعوں کی تحریر دین سے متنفر ہو کر ان کی تقلید میں بسا اوقات اعتدال سے بڑھ جاتے ہین، اور یزید کی خلافت کے اثبات اور حضرت امام حسینؓ کے جہاد اور آپکی کی شہادت پر بحث شروع کر دیتے ہیں، ابصار العینین میں مذہب اور عقائد کی روشنی میں اس قسم کے خیالات کی تردید کی گئی ہے، گو ہم کو اسکی تمام تفصیلات سے اتفاق نہیں ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے، کہ خلافت نیابت نبوی اور اقامت دین کا منصب جلیل ہے، اس لحاظ سے یزید کی حکومت قطعی خلافت نہ تھی، یہ اور بات ہے کہ اس عہد کے علماء نے اسلامی مصالح اور مسلمانوں کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے اس کو خلافت کا محض نام دیدیا تھا،

(م)

دار المصنفین کی ادبی کتابیں

شعر الہند حصہ اول، جس میں قدماء کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۵۴۴ صفحے، قیمت للعہ، از مولنا عبد السلام ندوی،

حصہ دوم، جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۹ صفحے، قیمت:۔ للعہ

گل رعنا - اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۰ صفحے، قیمت:۔ [illegible]، از مولنا سید عبد الحئی صاحب مرحوم،

مکاتیب شبلی، مولنا شبلی مرحوم کے دوستون، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم،

حصہ اول - ضخامت ۳۴۹ صفحے، قیمت:۔ ۱۲/ عہ

حصہ دوم، " ۲۶۱ " " ۱۲/ عہ

موازنۂ انیس و دبیر (از مولنا شبلیؒ) اردو کے مشہور باکمال شاعر میر انیس کی شاعری پر ریویو، اردو میں فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین مرثیوں کا انتخاب اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو میں اپنے فن میں یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت ۲۸۴ صفحے، قیمت: [illegible]

کلیات شبلی اردو، مولنا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت:۔ [illegible]

افادات مہدی، ملک کے نامور انشا پرداز مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت: ۱۲/ حجم ۳۲۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جس میں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے، ۲/ کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں، (از مولنا سید ریاست علی ندوی)